ستم
(ناول)
ڈاکٹر سائرہ اقبال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مستم

(ناول)

مستم

(ناول)

ڈاکٹر سائرہ اقبال

○ لاہور ○ کراچی ○ حیدرآباد

e-mail:fictionhouse1991@gmail.com

نام کتاب	:	مستم (ناول)
مصنفہ	:	ڈاکٹر سائرہ اقبال
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
پبلشرز	:	فکشن ہاؤس، لاہور
کمپوزنگ	:	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	:	سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق	:	ریاض ظہور
اشاعت	:	2022ء
قیمت	:	-/700روپے

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 68-مزنگ روڈ، لاہور۔فون: 042-36307550-36307551

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر، حیدر چوک، حیدرآباد۔فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور، دوکان نمبر 5 اردو بازار، کراچی۔فون: 021-32603056

لاہور ○ کراچی ○ حیدرآباد

e-mail:fictionhouse1991@gmail.com

اقتباسات

(۱)

پسندیدگی ایک دو دن کی ہو یا چاہے ایک دو سالوں کی۔۔محبت کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔محبت میں بس عادت ہے اور کچھ نہیں۔اب عادت پہ انحصار کرتا ہے کہ اور کتنی مدت میں ہوتی ہے۔بعض اوقات صدیاں بیت جاتی ہیں اور کسی کی عادت نہیں ہوتی اور بعض اوقات پل بھر میں ہی عادت ہو جاتی ہے۔بس محبت عادت کا اتار چڑھاؤ ہے۔محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس کا شائد ردوبدل ہوتا ہے۔کیونکہ عادت کا متبادل ہوتا ہے۔کافی کی عادت ہو جائے تو چھوڑنا مشکل ہوتا ہے ہاں مگر اس کافی کی کمی کو چائے سے پورا کرنے کی کوشش کی جائے تو کافی کا ذائقہ بھول جاتا ہے اور عادت چھوٹ جاتی ہے۔اس طرح محبت کا متبادل بھی ہوتا ہے۔دو دن ایک سے کی اور دو دن ایک سے۔۔کمی پوری ہو جاتی ہے۔ دیوانگی کا متبادل کیا ہو سکتا ہے؟ وہ تو سنتی ہی نہیں کسی کی۔مچھلی کو پانی کی عادت نہیں ہے۔بلکہ وہ پانی کی دیوانی ہے۔نہیں یقین آتا تو پانی سے نکال کے دیکھ لو۔ جی نہیں پائے گی۔۔پر۔۔۔ پانی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بہنا ہوگا تو بہے گا۔۔۔اپنی روانی سے۔بہا کے لے جانا ہوگا تو بہا لے جائے گا۔کسی کو ڈبونا ہوگا تو ڈبو لے گا۔۔۔اپنی گہرائی میں۔۔۔ بس یہی فرق ہے۔۔۔محبت اور دیوانگی میں!!

(وفا کا پودا شجر ہوا)

(۲)

کمرے میں گھُپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ کھڑکیاں دروازے سب بند کئے ایک کونے میں سمٹی بال بکھیرے بیٹھی تھی۔اس کے کانوں میں ایک ہی صدا گونج رہی تھی، 'خواب لےلوخواب۔۔۔' وہ کبھی کانوں پہ ہاتھ رکھتی تو کبھی اٹھ کرکھڑکی سے باہر جھانکنے کی کوشش کرتی۔مگر باہر کچھ نظر نہ آتا۔ کیونکہ کھڑکی کو کالے کپڑے سے ڈھک دیا گیا تھا۔کپڑا ہٹانے کی گنجائش تھی نہ باہر جھانکنے کی۔ دیوانوں کی طرح کمرے میں ادھر سے اُدھر گھومتی رہتی، کبھی جھٹ سے پیچھے مُڑ کے دیکھتی۔ اسے کوئی بھاری بھرکم ہاتھ اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اس ہاتھ سے بچ کر کبھی پلنگ کے نیچے چھپتی تو کبھی صوفے کے پیچھے۔

'خوب لےلوخواب۔۔۔' اس کے کانوں میں مسلسل ایک ہی صدا گونجتی تھی۔

'یہ۔۔۔ یہ کتنے کے ہیں؟' وہ ہانپتی کانپتی ادھراُدھر پھرتی رہی۔

'سوروپے۔۔۔' وہ ہنسنے لگی، دیوانہ وار قہقہے کمرے میں گونجنے لگے۔

'بس سو روپے۔۔۔؟ اتنے سستے خواب۔۔۔لے لو۔۔۔ تم بھی لے لو۔۔۔'

(افسانہ: خواب لےلوخواب)
کتاب: مکمل کچھ نہیں ہوتا

انتساب

الحمداللہ رب العالمین

میں ہر اس خیال کی ممنون ہوں، جو خلاء میں سفر کرتا میرے دماغ کے دریچے کو ٹکرایا اور اپنی جگہ بناتا ہوا قلم کے ذریعے کاغذ پر اترا۔ ہر اس کردار کا شکریہ جو جانے انجانے میں اس ناول کا، اس کہانی کے اتار چڑھاؤ کا حصہ بنے۔ ہر اس ہستی کا شکریہ جس نے لکھنے کے لئے سراہا۔ میرے والدین کا شکریہ جن کو ہردم یہ انتظار ہوتا ہے کہ میری اگلی کتاب کب آئے گی؟ میرے جیون ساتھی کا شکریہ جو زندگی کے ساتھ ساتھ میرے لفظوں کے بھی ساتھی بنے۔

'منیر فیاض صاحب' کا شکریہ، جن کا نام ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ میرا ناول ہو، افسانہ ہو یا پی ایچ ڈی کا مقالہ، انہوں نے ہمیشہ بے غرض ہوکر، وقت نکال کر نہ صرف پڑھا بلکہ میری رہنمائی بھی کی کہ کس طرح میں اپنی تحریر کو بہتر بنا سکتی ہوں۔

محمد عاقل ضیاء اور یوسف ابراہیم صاحب کا شکریہ جنہوں نے اس مسودہ کی پروف ریڈنگ کی اور میری اصلاح کی۔

میرے قلم سے!!

یہ کتاب کچھ خاص بھی ہے۔اس پر کام 2016 میں شروع کیا تھا۔کافی حد تک لکھی جا چکی تھی مگر Writer's Block نے کچھ ایسا بلاک کیا کہ ناول مکمل نہ کر پائی ، ہاں افسانوی مجموعے پر کام شروع کیا، مکمل بھی کیا اور شائع بھی کروایا۔ قارئین اور اساتذہ کو منفرد بھی لگا اور تحریر میں بہتری بھی نظر آئی۔

'مستم'!! ایک ایسی کہانی جس میں کردار اپنی دُنیا میں مست نظر آئیں گے،کوئی عشقِ مجازی کو محور بناتا مست ہوگا تو کوئی عشقِ حقیقی کی سیڑھیاں چڑھتا ایک ایسا رُتبہ پالیتا ہے کہ بس رب کا حکم کی معنی رکھتا ہے، باقی ہر چیز بے معنی۔

مستم جب پڑھیں گے تو کبھی گڈو کی جھلک نظر آئے گی، اس کی معصومیت، اس کا خلوص، اس کی محبت کے لئے تلاش نظر آئے گی تو کبھی شجر کی مضبوط شخصیت، اس کے مصمم ارادے پڑھنے والوں کو ایک تحریک بخشتے نظر آئیں گے۔مگر شجر اور مشراز میں بنیادی فرق یہ ہے کہ شجر نے اپنی زندگی میں محنت آغاز سے ہی کی تھی جبکہ مشراز منہ میں سونے کا نوالہ لے کر پیدا ہوا۔ زمینوں، دکانوں کا مالک، خوبصورت شیر جوان جس پر ہر ماں کی نظر ہو کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ اس سے طے کرے کیونکہ وہ بظاہر ایک مکمل انسان تھا جو وہ تمام خوبیاں لے کر پیدا ہوا تھا جنکی خواہش کی جاسکتی ہے۔ ہمارے معاشرے کا المیہ یہ بھی ہی کہ شادی ایک سرٹیفکیٹ کے لئے کی جاتی ہے۔ جتنی قابل اور خوبصورت لڑکی ہوگی اتنا دکھایا جا سکتا ہے کہ ہمارا لڑکا کتنا قابل ہے۔ یہ گھر گھر کی بات نہیں ہاں مگر ایک خاص تعداد میں لوگ اس

سوچ کے حامی ضرور ہیں۔ یہی حال مشراز کے حوالے سے تھا۔ سب کی نظریں اس پر تھی مگر اس کی سوچ مختلف تھی۔ اسے مکمل چاند نہیں بلکہ ادھورا چاند پسند تھا۔ وہ کہتا تھا کہ مکمل شے تو ہر کسی کو اچھی لگتی ہے۔ انسان ادھوری شے سے محبت کرکہ اس کی تکمیل کرے تو بات ہے۔ شجر نے Maslow کی Hieracrchy کو اپناتے ہوئے اپنے سفر کا آغاز بنیادی ضروریات پوری کرنے سے کیا۔ سر پر چھت ہو، پیٹ بھرا ہو پھر ہی محبت کی کہانیاں اچھی لگتی ہے۔ مشراز محبت کا سفر طے کرتے ہوئے محبت سیکھنا چاہتا تھا۔ جو اس نے کیا۔

کہتے ہیں کہانی لکھی جا چکی ہے۔ ہم بس کردار ہیں اور اداکاری کر رہے ہیں۔ اس طرح کہانی لکھی جا چکی ہوتی ہے۔ اداکاروں کی اداکاری اور acceptance معنی رکھتی ہے۔ جب قلم اٹھاؤ تو بہت سے اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ کہانی بے تحاشہ کروٹیں لیتی ہے۔ کبھی اسلام آباد کی شہری اور Possesive محبت اور کبھی گاؤں کی انمول اور بے فیض محبت، ہاں مگر یہ مفہوم Person to Person تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ محبت میں عمر کی کوئی قید نہیں، رنگ، ذات پات سے ماورا ہے اور ہاں یہ بات تو ثابت شدہ ہے مگر تسلیم کرنے میں وقت لگتا ہے۔ محبت، عشق، جنون، دیوانگی۔۔۔ کئی نام ہیں اس جذبے کے۔ اس میں سب سے ضروری جزو 'حیا' کا ہے۔

حیا کی چادر۔۔۔ جیسے کہ ناول میں بھی مرکزی کردار ایک بزرگ سے سوال کرتا ہے کہ حیا کی چادر آخر ہے کیا؟ جواب ملتا ہے کہ یہ چادر ایک اعزاز ہے۔ اور داستانِ محبت کی تکمیل بھی اسی چادر سے ہوتی ہے۔ اس داستانِ محبت کی تکمیل ہوئی یا ایک اور داستان کو پروان چڑھا، یہ قارئین پڑھ کر بتائیں گے۔

ڈاکٹر سائرہ اقبال

saira_iqbal10@yahoo.com

www.facebook.com/Saira-Iqbal

اسلام آباد

جھکی ہوئی کمر کے ساتھ چہرے کی جُھریاں اور بالوں کی سفیدی اپنی خوبصورت سی مُسکان میں چُھپائے وہ بوڑھا اپنی ہم سفر سے خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ کبھی اس کے جوان اور حسین چہرے کی جانب دیکھتا تو کبھی لاؤنج میں موجود اپنے بچوں کی تصویر پہ نظر ڈالتا اور کہتا۔۔۔۔۔ 'دیکھو پتا ہی نہیں چلا اور وقت گزر گیا۔۔۔صرف گزر ا ہی نہیں بلکہ اتنا گزر گیا کہ پتا ہی نہیں چلا'۔

لاؤنج کی کھڑکی کھلی تھی۔ شام ڈھلنے کو تھی تو سرد ہوائیں اندر آنے لگیں۔ وہ جھٹ سے اُٹھا، کھڑکی بند کی پھر بولا 'مجھے آج بھی تمہارا اتنا ہی خیال ہے، تمہیں سردی نہ لگ جائے تو دیکھو اِس بڑھاپے میں بھی اتنی پُھرتی سے اُٹھا ہوں۔۔۔ بلکہ دوڑ لگائی ہے'۔ وہ مُسکرایا۔

پھر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا ایک نظر سے اپنی بیوی پر ڈالی اور کہا 'یاد ہے، تمہارے گاؤں میں۔۔۔۔ جب پہلی بار تمہیں نظر بھر کر دیکھا تھا، اِسی طرح سرد ہوائیں چل رہیں تھیں۔۔۔ میں شہر سے آرہا تھا۔۔۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ مجھے چھٹیاں تھیں۔۔۔۔ سردیوں کی۔۔۔ تب تمہارا مزاج بھی بہت سرد سا ہوتا تھا۔۔۔ ویسے آیا تو پہلی بار گرمیوں میں تھا، ملاقات بھی تب ہوئی مگر تب محبت نہیں ہوئی، نظر بھر کے تب دیکھا جب تمہاری محبت دِل میں لے کر آیا تھا۔۔۔۔ خاص تُم سے مِلنے'۔

اُس نے ایک قہقہہ لگایا۔ 'تو اور کیا۔۔۔' اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔۔۔۔

'تم ہمسائے کے بچوں کو باہر تک چھوڑنے آئی تھی'۔۔۔۔۔۔'تم نے۔۔۔۔۔۔' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔۔۔'اب کیا کروں۔۔۔عمر اتنی ہوگئی ہے ناں۔۔۔۔ یاد تو سب ہے۔۔۔'اُس نے اپنی بیوی کے مُسکراتے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا۔۔۔'سچ میں۔۔۔'سچ میں۔۔۔سب یاد ہے۔۔۔'تم نے پیلا سوٹ پہنا تھا۔۔۔'وہ ہنسا۔۔۔'نہیں۔۔۔!!!'

اُس نے لاؤنج کی کھڑکی سے باہر برستی بوندوں کو دیکھا ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا'یاد ہے پاگل۔۔۔تم نے نیلے رنگ کا سوٹ پہنا تھا'۔

'دیکھو۔۔۔ بارش !! کتنی حسین لگتی ہے۔۔۔پُر سکون۔۔۔ رم جھم رم جھم۔۔۔ایک لَے کے ساتھ برستی ہے'۔

اُس نے مُڑ کے اُس کی طرف دیکھا اور کہا'جتنا گہرا بادل اور بارش کا رشتہ ہے ناں۔۔۔میرا اور تمہارا رشتہ اِس سے بھی زیادہ گہرا اور مضبوط ہے'۔

....

لاہور چونگی نمبر ۲۲ نور ہاسٹل 1964ء

ہاسٹل کے کمرے کی کھڑکی کھُلی تھی۔اُس کے کمرے کی کھڑکی باہر مین روڈ پر کھُلتی تھی جس کی وجہ سے ہر وقت کا شور اندر آتا رہتا تھا۔

'سبزی لے لو۔۔۔!!'ٹماٹر لے لو'۔۔۔سبزی والے کی آواز تو کبھی غبارے والے کا باجا۔

'اے بھائی، رُکنا ذرا'۔۔۔اور یہ سامنے والی آنٹی کی آواز۔اِس کی کمی تھی۔

اُس نے فوراً کتابیں سمیٹیں، بیگ میں ڈالیں اور کالج کا رُخ کیا۔

سیڑھیاں اُترتے ہوئے کوئی بیس پچیس لوگوں سے علیک سلیک ہوئی اب دعا کر

رہی تھی خالہ رقیہ نہ ملیں۔ ورنہ آدھا گھنٹہ تو یوں ہی گیا۔

وہ اللہ اللہ کر کے گیٹ سے باہر نکلی اور شکر ادا کیا کہ کوئی اور نہیں ملا۔ گلی کی نکڑ سے سیدھی طرف ہی مُڑی تھی کہ اچانک واپس اُلٹے پاؤں اپنی سمت بدلنی پڑی مگر ہوا وہی جس کا ڈر تھا۔

ارے نازلی بیٹا رُکو تو سہی ۔۔۔ اور یہ تھی خالہ رُقیہ کی آواز۔

جی آنٹی ۔۔۔ کیسی ہیں آپ ۔۔۔ میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔ نازلی نے بہانہ بنایا۔

'ارے ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تم نے ہمیں دیکھا نہ ہو ۔۔۔ ارے بیٹی رُقیہ تو اُڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہے۔ تم تو مجھے دیکھ کے بھاگے چلی جا رہی تھی، ارے چلو ۔۔۔ معاف کیا ۔۔۔ یہ بتاؤ، ابھی پرچے مکمل نہیں ہوئے۔ ارے گھر کب جانا ہے تم نے ۔۔۔ تمہارے گھر والوں کو کوئی فکر ہے یا نہیں، گاؤں کون سا ہے تمہارا۔ خیر چھوڑو ۔۔۔ یہ بتاؤ کہ جا کہاں رہی تھی، گرمی بہت ہے گڑیا، کسی چھتری یا چادر سے سر ڈھک لیا کرو۔ گرمی نہیں لگے گی۔ لُو لگ گئی تو بیمار ہو جاؤ گی، امتحان کیسے دو گی۔ گھر والوں نے پڑھنے بھیجا ہے ۔۔۔ !! خیر چھوڑو ۔۔۔ یہ بتاؤ کہ ۔۔۔۔۔'

خالہ! نازلی نے کچھ کہنا چاہا۔

'ارے کہو بیٹی ۔۔۔ اتنے پیار سے خالہ کہا ہے، کہو تو جان بھی دے دُوں ۔۔۔ حکم تو کرو ۔۔۔' خالہ رُقیہ اپنی ہی دُھن میں بولے چلے جا رہی تھیں۔

'خالہ مجھے دیر ہو رہی ہے'۔ نازلی نے تھوڑی جھجک کے کہا۔

'جاؤ ۔۔۔ بھئی ۔۔۔ ہم نے کون سا روک رکھا ہے ۔۔۔' خالہ نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

نازلی تیز تیز قدموں سے آگے بڑھی۔ خالہ رُقیہ نے پھر آواز لگائی، 'ارے پیدل

نہ جاؤ۔۔۔گرمی بہت ہے۔۔۔‘

ساتھ ہی رکشے والے کو آواز لگائی۔۔۔’اے بھائی۔۔۔ زرا رُکیو تو۔۔۔ وہ بچی۔۔۔سبز سوٹ والی۔۔۔اُس کو چھوڑ دو۔۔۔جاؤ جلدی‘!!

....

گورنمنٹ کالج لاہور 1964

دھوپ، گرمی اور امتحانات کی وجہ سے کالج میں ویرانہ تھا، ہاں البتہ لائبریری اور لان میں سایہ دار درختوں کے نیچے کچھ طلبہ و طالبات گروپ کی شکل میں بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ نازلی سب سے الگ تھی۔ عادات واطوار میں بھی اور پہننے اوڑھنے میں بھی۔ کالج کی زیادہ عوام کسی نہ کسی دیہات سے تعلق رکھتی تھی۔ جب کہ نازلی کا بچپن لڑکپن سب لاہور شہر میں ہی گزرا۔ لان میں داخل ہوتے ہی وہ مخصوص درخت کی طرف بڑھی جہاں اُس کی سہلیاں اُس کا انتظار کر رہیں تھیں۔ مگر لان سے بھی گزرتے ہوئے اُسے درجنوں لوگوں سے سلام دُعا کرنی تھیں اور بالآخر وہ اپنی سہیلیوں تک پہنچ گئی۔

’ذرا بتاؤ۔۔۔رُک رُک کے ہر ایک سے سلام دُعا ضروری ہے؟ تُم نے پورے دس منٹ وہاں سے یہاں تک لگا دیئے ہیں‘۔ فاطمہ نے انتہائی ترش لہجے میں کہا۔

’تم تو ہر وقت جلی کٹی بیٹھی رہا کرو‘ صائقہ نے کہا۔

’اچھا اچھا۔۔۔اب تو آ گئی ہوں ناں۔۔۔چلو پڑھنا شروع کریں۔۔۔‘ نازلی نے کہا۔

’ہاں چلو۔۔۔‘ نائمہ نے کہا۔

’اچھا سنو۔۔۔! وہ۔۔۔جاوید لوگوں کا گروپ وہاں بیٹھا ہے، اُن کو بھی بلا لیتے ہیں۔ اُنہوں نے بھی یہیں سے شروع کرنا ہے‘۔ نازلی نے کہا۔

’تم زیادہ سوشل نہ بنا کرو۔۔۔ہم خود ہی پڑھ لیں گے۔۔۔کوئی ضرورت نہیں ہے لڑکوں کو بُلانے کی۔۔۔‘فاطمہ نے کہا۔

’بھئی کلاس فیلوز ہیں‘۔۔۔نازلی نے کہا۔

’وہ جمشید بھی ہے ساتھ کیا؟؟‘ صائقہ نے مُسکراتے ہوئے پوچھا۔

’جی سب تھے۔۔۔‘نازلی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

’میں چلی جاؤں گی پھر۔۔۔‘صائقہ نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

’اچھا اچھا۔۔۔چلو پڑھنا شروع کرتے ہیں‘۔۔۔

’chapter 14 نکالو وہ سب سے اہم ہے۔۔۔‘صائقہ نے کہا۔

’ہاں۔۔۔ میرے بھی ذہن میں یہی تھا۔۔۔ ٹھہرو۔۔۔ میں نوٹس نکالتی ہوں۔۔۔‘یہ کہتے ہوئے نازلی بیگ میں ہاتھ مارنے لگی۔

’مجھے یاد آیا۔۔۔وہ نوٹس تو مشراز کے پاس تھے۔۔ ہاں۔۔۔ٹھہرو میں لے کے آتی ہوں۔۔۔‘یہ کہتے ہوئے نازلی نوٹس لینے چلی گئی۔

....

’ہیلو مشراز!!‘ وہ نوٹس تھے آپ کے پاس۔۔۔نازلی نے مشراز سے کہا۔

’ہاں جی۔۔۔ ہیں بھی۔۔۔ لیجئے۔۔۔‘مشراز نے یہ کہتے ہوئے اُسے نوٹس واپس کئے۔

’Thankyou۔۔۔‘نازلی نے کہا۔

’شکریہ تو آپ کا۔آپ نے ہمیں نوٹس دیئے۔‘مشراز نے جواب دیا۔

’نہیں ایسی کوئی بات نہیں ، کلاس فیلوز کا فرض ہے ایک دوسرے کے کام آئیں۔۔۔‘نازلی نے دو چار روایتی جملے کہہ ڈالے۔

جواب میں وہ صرف مُسکرا دیا۔

’آپ مُسکراتے ہوئے اچھے لگتے ہیں‘۔ وہ ایسی ہی تھی ، شہر کی ایک بولڈلڑکی ۔ جومنہ میں آتا بول دیتی ۔

’شکریہ‘۔اُس نے کہا۔

’آپ کی واپسی کب ہے؟ نازلی نے پوچھا۔

’واپسی مطلب؟؟‘ اُس نے سوال کیا۔

I am sorry میرا مطلب تھا،آپ گھر کب جارہے ہیں؟؟ نازلی نے پوچھا۔

’گاؤں کا پوچھ رہی ہیں؟؟‘ اُس نے سوال کیا۔

’جی بالکل!‘ نازلی نے جواب دیا۔

’گوکھووال ہے میرا گاؤں‘۔۔۔’کل صبح سویرے نکل جاؤں گا‘۔مشراز نے جواب دیا۔

’اچھا۔۔۔صحیح۔۔۔!!‘ نازلی نے کہا۔

آئیں آپ کو چائے شائے پلائیں۔۔۔‘مشراز نے کہا۔

’نہیں Thankyou پھر کبھی ،ابھی میری سہیلیاں انتظار کررہی ہیں۔۔۔‘نازلی نے کہااوراجازت چاہی ۔

وہ واپس آکراپنے دوستوں میں بیٹھ گیا۔

’یارشیرو!!‘ فلک نے کہا

’خیرہو!!‘مشراز نے جواب دیا۔

’یہ نازلی جی کچھ زیادہ ہی نہیں آتیں جاتیں‘ ۔فلک نے کہا

’پتا تھا کوئی بکواس ہی کرے گا۔ابے میں نے نوٹس لئے تھے۔دینا بھول گیا‘ مشراز نے کہا۔

’تیری یادداشت! جاوید نے کہااور پانچوں دوست قہقہہ لگانے لگے ۔

’بکتے رہو۔میرا کیا ہے!!‘ مشراز نے کہا۔

’اچھا یار!! Back to Study‘جمشید نے کہا اور سب پڑھنے میں مگن ہو گئے۔

....

گوکھووال (فیصل آباد) 1964ء

’اماں۔۔۔بھائی شیرو نے آنا ہے آج‘؟؟ نائلہ نے ماں نے پوچھا۔

ہاں پتر، کہا تو تھا۔آج تاریخ کیا ہے؟‘ماں نے پوچھا۔

’جون کی تیرہ۔‘نائلہ نے جواب دیا۔

’ہاں میرے پتر نے کہا تھا ، جون کی تیرہ تاریخ۔صبح دس بجے تک پہنچوں گا۔‘ماں نے بڑے فخر سے جواب دیا۔

’ٹائم بھی بتا۔‘ماں نے پوچھا۔

’اماں۔ابھی آٹھ بجے ہیں۔‘نائلہ نے جواب دیا۔

’بس دو گھنٹے تک میرا شیرا آ جائے گا۔شیر پتر ہے میرا، لاہور شہر میں پڑھتا ہے۔ انگریزوں کے کالج میں۔80 سال پرانا کالج ہے۔شہر کا سب سے بڑا کالج۔‘ماں کی ہمیشہ کی تقریر شروع ہو گئی۔

’اچھا اماں بس۔‘نائلہ نے کہا۔

’جا جا زیادہ باتیں نہ بنا۔۔۔چائے بنا میرے لئے۔۔۔ماں نے نائلہ کو تاکید کی۔

’دو گھنٹے تو رہ گئے ہیں، بھائی شیروں کے ساتھ ہی پی لینا اب۔‘نائلہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

’چائے بنا۔شیرو کے ساتھ بھی پی لوں گی، شکر ذرا تیز رکھنا۔‘ماں نے کہا۔

'اچھا، اماں!! روز روز یہ اعلان کرنا ضروری نہیں ہوتا۔۔' نائلہ نے کہا اور چولہے کی طرف بڑھی۔

(دروازے پہ دستک ہوتی ہے)

'اے کون ہے؟؟' ماں نے آواز لگائی۔

نائلہ دیکھ تو کون ہے، باہر نہ جائیو۔۔آواز لگا کے پوچھیو۔۔' ماں نے تاکید کی۔

'کون۔۔۔۔نائلہ نے آواز لگائی'۔

'یہاں سے آواز کیا خاک جائے گی؟، صحن میں جا کے پوچھ لے۔۔' ماں نے کہا۔

'ایک تو دھوپ اتنی ہے ماں'۔ نائلہ بڑبڑاتی ہوئی اُٹھی۔

'جی کون؟؟' نائلہ نے پوچھا۔

'میں رفیق۔۔۔شیرو آ گیا کیا گڑیا؟'۔ دروازے کے دوسری جانب سے آواز آئی۔

'نہیں بھائی رفیق۔۔۔ابھی اُس کی بات زبان سے نکل نہ پائی تھی کہ ماں بھاگی ہوئی آئی۔

'نہیں آیا میرا شیرا ابھی۔۔۔نائلہ ذرا وقت تو بتا' ماں نے کہا۔

'نائلہ بھاگتے ہوئے ٹائم دیکھ کہ آئی اور بتایا۔۔اماں۔۔۔ساڑھے نو۔

ماں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا، 'پورا آدھا گھنٹہ بچا ہے، بہت تابعدار بچہ ہے میرا، کہا تھا دس بجے آؤں گا'۔

'سلام خالہ!' دروازہ کھلتے ہی رفیق نے جھٹ سے سلام لیا۔

'جیتا رہے فیکے'۔ ماں نے جواب دیا۔

'سلام بھائی رفیق'۔نائلہ نے کہا۔

وعلیکم السلام گڑیا۔رفیق نے جواب دیا۔

'بس چلتا ہوں خالہ،شیرو آئے تو کہنا کہ رات آٹھ بجے وہ چوہدریوں کے کھو پہ آجائے،ہم انتظار کریں گے۔'رفیق نے کہا۔

'ہاں میں بتا دوں گی،دیکھ میرے شیروں سے سب کتنا پیار کرتے ہیں،ابھی پہنچا نہیں یار بیلی پہلے آن کھڑے ہوئے'۔ماں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

'بھائی شیرو ہے ہی اتنا اچھا'۔نائلہ نے ماں کی ہاں میں ہاں ملائی۔

....

چوہدریوں کا کھو، گوکھووال فیصل آباد

چاروں طرف ہریالی اور درختوں کی وجہ سے جون جیسے گرم مہینے میں بھی خوشگوار احساس ہو رہا تھا۔ جہاں تک نگاہ دوڑائی جا سکتی تھی، سرسبز باغ اور پھلوں کے پیڑ تھے۔ دائیں جانب ایک گہرا کنواں اور بائیں جانب ٹیوب ویل تھا۔ چاروں طرف جامن کے درخت کے نیچے چارپائیاں بچھائے سب شیرو کا انتظار کر رہے تھے۔ باغ کے دائیں جانب سے کوئی شخص ہاتھ میں لالٹین اُٹھائے چارپائیوں کی جانب دوڑتا چلا آ رہا تھا، وہ ہاتھ میں لالٹین نہ بھی پکڑتا تو اس کا چہرہ چاند کی طرح روشن اور چمکدار تھا۔

'یار شیرو۔۔۔آنکھیں تو تیری کمال ہے، ہے تو فیصل آباد کا مگر رُوپ کشمیریوں والا ہے، فیصل آباد کا گھبرو جوان ہے مگر حقیقتاً کسی کہانی کا رومیو لگتا ہے۔اُس کی خوبصورتی کے چرچے تو ہر طرف تھے۔دوست تو دوست، گاؤں والے شہر والے بھی اُس کے رُوپ کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔گاؤں کا چوہدری تک اپنی بیٹی، گھر، جہیز، کار سمیت دینے کو تیار تھا اور زمینوں میں بیٹی کے حصے کے علاوہ شیرو کا حصہ بھی تیار تھا۔ بالآخر وہ دوستوں تک

پہنچ گیا۔

سب چار پائیوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور بہت جوش وخروش سے ملے۔

'یار شیرو۔۔۔اِس بار دیر لگا دی۔۔۔پُورے چار ماہ بعد آ رہا ہے۔' انیس نے گلہ کرتے ہوئے کہا۔

'بس یار۔۔۔مصروفیت ہی ایسی تھی، سوچا اب کی بار امتحان سارے دے کر ہی آؤں۔' شیرو نے جواب دیا۔

'سچ بتا۔۔۔زیادہ دل تو نہیں لگ گیا شہر میں؟؟' رفیق نے ہنستے ہوئے کہا اور ہنستے ہنستے اُس کے پیروں میں آ کے بیٹھ گیا اُس کے گھٹنے پکڑے اور کہا' بتا ذرا۔۔۔قسم اُس حسینہ کی خالہ کو کچھ نہیں بتاؤں گا'۔

'ابے جا یار!! تیری قسم۔۔۔پڑھائی میں مصروف تھا۔' شیرو نے کہا۔

'دیکھ شیرو!! تو نے اچھا نہیں کیا میری جھوٹی قسم کھا کے'۔ رفیق نے واپس چار پائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

'او یار۔۔۔شیرو یاروں کا یار ہے، جان دے دے گا یار کی جان نہیں لے گا۔ خدا قسم کسی حسینہ کا چکر نہیں۔' شیرو نے کہا۔

'اچھا۔۔۔وہ گڑوی میں سے کچی لسی تو نکال جیلے۔۔۔' رفیق نے جلیل کو کہا۔

'سو بسم اللہ اُستاذ۔۔۔جلیل گڑوی میں لسّی نکالنے لگا۔

'یار شیرو۔۔۔پُورے چار ماہ کی باتیں اکٹھی ہوئی پڑی ہیں۔۔۔ساری آج کروں یا مہینہ ہے ادھر؟؟' رفیق نے پوچھا۔

'ہاں یار پورا مہینہ ادھر ہوں، پھر جاؤں گا چاچی کے پاس سرگودھے، رسول آباد۔۔۔پنڈ ہے چاچی کا۔۔۔وہاں کوئی پندرہ دن رہ کے پھر لاہور۔' شیروں نے جواب دیا۔

جلیل نے لسّی کا گلاس شیرو کے آگے بڑھایا اور کہا 'لو سرکار، پنڈ کے خالص دودھ کی لسّی ۔۔۔اوی کچی ۔۔۔' اور ہنسنے لگا۔

'یار جلیل تو بھی ۔۔۔سیدھا سیدھا کہتا کہ لے شیرو ۔۔۔کچی لسّی ۔۔۔' شیرو نے ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

'او یار شہر والے بھائی او تسی ، اسی پنڈ دے جاہل پینڈو ۔۔۔عزت دیتے ہیں تمہیں یار!! ۔۔۔' جلیل نے ہنستے ہوئے کہا۔

'اچھا سُن، بھولے نے شیرو کی کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔۔۔' زرا رفیق سے پُوچھ آج کل کن چکروں میں پڑا ہے؟؟' اور کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

شیرو نے بھولے کو آنکھ مارتے ہوئے کہا' صبر کر ذرا، ابھی کلاس لیتے ہیں'۔

'او یار فیکے ۔ادھر تو آ ، ادھر میرے پاس بیٹھ ،اتنی دُور بیٹھا ہے۔' سارے دوست ہنسنے لگے۔

'ہاں سرکار، حکم کرو ۔۔۔' رفیق چارپائی گھسیٹتے ہوئے شیرو کے پاس لایا۔

'کن چکروں میں ہے آج کل؟؟' شیرو نے پوچھا۔

'تیری قسم جو کبھی کسی کو بتایا تو ۔۔۔' شیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

'نکڑ والا درزی ہے ناں؟؟ وہ حمید۔' رفیق ہنسنے لگا۔

'ہاں !! شیرو نے کہا ۔۔۔ مجھے یاد ہے وہ جو لنگڑا ہے'۔

'آہو ۔۔۔!! اُس کی ۔۔۔' رفیق ہنسنے لگا۔

'یہ نہ کہنا اُس کی بیٹی سے چکر چلا رہا ہے ۔۔۔' شیرو نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

'نہ اُستاد جی ۔۔۔' رفیق نے ہنستے ہوئے کہا۔

'او خبردار!! ایسے معاملوں میں مجھے نہ اُستاد کہا کر ۔۔۔' شیرو نے کہا

'ارے سُن تو لے ۔۔۔اُس کی نواسی ہے'۔ رفیق نے ہنستے ہوئے کہا

'او تیری۔۔۔۔۔شرم کر۔۔۔۔۔' شیرو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

'بچی ہے ابھی وہ۔۔۔آدھی عمر کی ہے وہ۔۔۔ یا خدا' شیرو نے سر پکڑتے ہوئے کہا۔

'بس کیا کروں شیرو بھائی، مجھے کم عمر، حسین، جوان لڑکیاں ہی پسند ہے اور اُس نے خود لائین کرائی تھی۔۔۔' رفیق نے وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا۔

'او یار۔۔۔ مجھے ان کاموں سے دُور رکھا کرو۔۔۔' شیرو نے چڑتے ہوئے کہا۔

'شیرو بھائی، تو مہینہ اِدھر ہے۔۔۔ کہے تو وہ سکینہ یاد ہے۔۔۔جو ہمارے ساتھ سکول میں تھی۔۔۔وہ چاچا کرمو کی بھتیجی۔۔۔ بڑی حسین ہے۔۔۔کمال ہے'۔رفیق نے کہا۔

'نہ میرا بھائی، حسین ہے تو میں کیا کروں۔۔۔ حسین ہوگی اپنے لئے۔۔۔' شیرو نے ٹوکرے سے ایک آم نکالتے ہوئے کہا اور ہاتھوں سے اُس کو نرم کرنے لگا۔

'دیکھ یار فیکے!!! اپنے تو دو ہی شوق ہیں۔۔۔۔اچھا لباس پہننا اور کتابیں پڑھنا۔ یہ کڑیاں شڑیاں۔۔۔نہ بابا۔۔۔نہیں سنبھالی جاتیں' شیرو نے کہا۔

'خالہ تو کب سے تیرا رشتہ ڈھونڈ رہی ہے' جلیل نے کہا۔

'ہاں تو ماں ہے، اُس کے ارمان ہیں کہ میرے سر پر سہرا سجائے، مگر شادی اور عشق و محبت بعد کی باتیں ہیں'۔شیرو نے کہا۔

'چل بتادے ایڈوانس میں، بھابھی کیسی ہو؟؟ ہم کچھ انتظام کریں۔۔۔' جلیل نے ہنستے ہوئے کہا۔

'تم لوگ ہنسو گے۔۔۔دفعہ کرو' شیرو نے آم چوستے ہوئے کہا۔

'یار جلیل ایک آم پھینکنا' ۔رفیق نے کہا

'نہیں بتادے، تیری قسم۔۔۔نہیں ہنستے!' جلیل نے رفیق کی طرف آم پھینکتے

ہوئے کہا۔

'یار!!۔ جو بھی ہو کوئی چار پانچ سال بڑی ہو۔۔۔ عشق کا مزہ تو آئے۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'شیرو بھائی۔۔۔!! خالہ کو جانتا ہے۔۔۔' رفیق نے پوچھا۔

شیرو ہنسنے لگا۔۔۔ 'جانتا ہوں۔۔۔ تبھی تو سوچا ہے۔ عشق اپنی مرضی سے کروں گا ، شادی تیری خالہ کی مرضی سے۔ شادی کے لئے لوگوں کو جواب دینا ہوگا۔۔ عشق میں کیسا سوال کیسا جواب!!!۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'چل آ، بابا فقیرے کے مزار پہ چادر چڑھائیں۔۔۔ اور دعا کریں تجھے تیرا عشق ملے۔' جلیل نے ہنستے ہوئے کہا۔

'گمی ہوئی چیز ملتی ہے جیلے ، بھائی شیرو کا عشق ابھی گواچا نہیں ہے۔ ابھی کرنا ہے، پھر گُم گیا تو چادر چڑھا دینا۔' رفیق نے کہا۔

'سرکار عشق ہو جائے تو گُمتا نہیں ہے۔۔۔ ساتھ ساتھ چلتا ہے، کبھی دُور، کبھی پاس۔۔۔ مگر سفر ساتھ ہی کرتا ہے۔' شیرو نے کہا۔

'ویسے شیرو۔۔۔ جتنا تو حسین ہے ناں۔۔۔ تیرا آدھا لاہور تیرے عشق میں گرفتار ہوگا'۔ بھولے نے کہا۔

'ارے نہیں بھولے، پہلی بات یہ کہ شہر میں کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہے اور دوسری بات یہ کہ عشق کا معیار حُسن تو نہیں، جہاں دل ملے وہیں سر جھکانے والا حساب ہے اور جب سر جھکا ہو تو محبوب کی صورت کہاں نظر آتی ہے۔ بس پھر تو پیر پکڑ کے جی سرکار، ہوں سرکار، تُو ہی تُو سرکار رہوتا ہے'۔

'بابا چراغ دین کے بارے میں یہی سُنا تھا۔۔۔ ایک پری کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا۔۔۔ وہ آرائیوں کا ڈیرہ نہیں ہے؟ وہاں۔۔۔ بس وہ دِن اور آج دِن۔۔۔

بابا فقیرے کے مزار پہ ہر چودھویں کی رات دھمالیں ڈالتا ہے'۔ بھولے نے نہایت معصومیت سے کہا۔

'اوجایار بھولے۔۔۔۔بھولیاں گلاں ہی کریں۔۔۔(معصوم باتیں ہی کرنا)۔ اُس پہ تو حاضری ہوتی ہے۔ حال چڑھتا ہے اور پھر کیا۔۔۔دم مست قلندر مست مست!!' رفیق نے ہنستے ہوئے کہا۔

'نہیں نہیں شیرو۔۔۔سب کہتے ہیں کہ اُسے بھی عشق ہوا تھا'۔ بھولا اپنی بات پر اڑا رہا۔

'ہاں ہوا ہوگا۔۔۔عشق نے بڑے بڑوں کو نچا دیا۔ رقص کرایا، دھمالیں ڈلوائیں۔ مست ہو کر لوگ اپنے پیروں کے قدموں میں سالہا سال پڑے رہے، عشق ہوجائے تو عاشق یہ تونہیں دیکھتا کہ محبوب کا رتبہ کیا ہے۔ بس عشق ہوا تو ایک فقیر کو بھی آقا کا رتبہ مل جاتا ہے۔ بابا چراغ دین کیا ہے پھر؟؟' شیرو نے کہا۔

'صحیح کہتے ہو شیرو۔۔۔' بھولے اور جلیل نے شیرو کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

شیرو نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔'بارہ بج گئے ہیں یار۔۔۔۔گھر چلتے ہیں۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'ہاں چلو' سب نے یک زبان ہو کر کہا اور اپنی اپنی لالٹین پکڑ لیں۔ جس رستے آئے تھے اُسی رستے سے واپس جانے لگے۔

'شیرو۔۔۔تُو شہر میں یہ ہریالی، کھیت اور یہ لالٹین (اُس نے ہنستے ہوئے کہا) اِس سب کو یاد تو کرتا ہوگا؟؟' رفیق نے پوچھا۔

'ہاں کبھی کبھی' ۔اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

'کبھی کبھی؟ وہ کیوں؟؟' جلیل نے حیرانی سے پُوچھا۔

'بس ۔۔۔کبھی کبھی فرصت کے لمحے نکال کر وہاں کے بیلیوں کو بتا دیتا ہوں کہ میرا گاؤں ایسا ہے ویسا ہے ۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'یعنی تو ہمیں فرصت میں یاد کرتا ۔۔۔؟؟ بس؟؟' جلیل نے پوچھا۔

'میں جہاں جاتا ہوں ۔۔۔ وہاں کا ہو جاتا ہوں ۔۔۔ اب دیکھو کیا میں نے شہر کو یا شہر کے دوستوں کو یاد کیا؟؟ نہیں ناں ۔۔۔ مگر میں انہیں بھولا بھی نہیں ۔۔۔ تو بس یہی حساب ہے'۔

شیرو نے ہنستے ہوئے کہا ۔۔۔

'یار شیرو ۔۔۔ تو بہت پڑھی لکھی باتیں کرتا ہے اب ۔۔۔' بھولے نے کہا۔

شیرو نے ایک قہقہہ لگایا۔

'سرکار تسی بے شک یہ لالٹین بجھا دیئو ۔۔۔' کھیتوں سے نکلتے ہی گاؤں کے ٹانگہ سٹاپ کے نکر پر موجود چاچا جی نے شیرو کو آواز لگائی ۔۔۔

'او سلام چاچا ۔۔۔' شیرو نے چاچا کو آواز لگائی اور اپنے قدم اس کی دُکان کی طرف بڑھا دیئے ۔۔۔

'آ جا میرا پتر ۔۔۔ جیتا رہ'۔ چاچا نے کہا۔

'شیرو نے آگے بڑھ کر چاچا کو گلے سے لگایا۔

'خیر ہو چا چا ۔۔۔ میرا قصور ۔۔۔ میں کیوں لالٹین کا استعمال نہ کروں ۔۔۔؟؟' شیرو نے پوچھا۔

'او پتر ۔۔۔ ایک چاند اوپر ۔۔۔ ایک چاند نیچے اور تیسرا یہ لالٹین تو نے پکڑ رکھی ہے ۔۔۔ اتنے چانن (روشنی) سے گاؤں والے یہ نہ سمجھیں کہ دن چڑھ گیا ہے ۔۔۔' چاچا ہنسنے لگا۔

'نہ چاچا ۔۔۔ پورے پنڈ کو معلوم ہے کہ شیرو سرکار آ چکے ہیں ۔۔۔ خالہ نے ہفتہ

پہلے سے ہی اعلان کر دیا تھا کہ شیرو آئے گا، جون کی تیرہ تاریخ۔۔۔صبح دس بجے۔۔۔ سارے پنڈ کی ماسیاں اپنی کُڑیوں سمیت چھت پہ چڑھ گئیں تھیں۔۔۔‘ رفیق ہنسنے لگا۔

’چل بدمعاش۔۔۔‘ چاچا نے اپنی لاٹھی سے رفیق کا مارتے ہوئے کہا۔

’یہ ہے ہی سوہنا۔۔۔اس کا چانن (روشنی) تونیرے (اندھیرے) دور کر دیتا ہے اور اس کی چہرے کی رونق تو ایسے جیسے پنڈ میں کوئی میلہ لگا ہو‘۔ چا چا ہنسنے لگا۔

’بس کرو چا چا یار۔۔۔اور سب خیریت ہے چا چا؟؟ بھائی سہیل ٹھیک ہے؟؟‘ شیرو نے پوچھا۔

’اللہ کا شکر پُتر۔۔۔رب سوہنے کا کرم ہے سب ٹھیک۔۔۔‘ چا چا نے کہا۔

’چل ٹھیک ہے شیرو۔۔۔ بھولے۔۔۔ہم اِدھر کو مُڑتے ہیں۔تم دونوں وہاں سے جاؤ‘، جلیل نے کہا۔

’کیوں یار ادھر سے ہی آ جاؤ۔۔۔‘ شیرو نے کہا۔

’نہ بھائی شیرو۔۔۔ چاچی غصے ہوتی ہے جیلے پہ۔۔۔ یہاں سے پھر پُرانا قبرستان بیچ میں آتا ہے نا۔۔۔تو وہیں سے جانے دو۔۔۔‘ بھولے نے کہا۔

’چلو پھر۔۔۔رب کے حوالے۔۔۔‘ شیرو نے کہا اور سب اپنے اپنے رستوں کو چل دیئے۔

....

گوکھووال (فیصل آباد)

’سُن شیرو۔۔۔!! بیٹا کتنی رہ گئی ہے شہر کی تعلیم؟؟‘ ماں نے پوچھا۔

’اماں ابھی تو پہلا سال ہے، ایک ڈیڑھ سال اور لگے گا پھر سولہ مکمل ہوگی۔ پھر کوئی اچھی سی افسری والی سرکاری نوکری ڈھونڈوں گا۔‘ شیرو نے جواب دیا۔

'اچھا تو بیٹا۔۔تو لڑکی بتا کیسی چاہئے۔؟منگنی تو کردوں نہ تیری۔'ماں نے کہا۔

'اماں اتنی جلدی کیا ہے؟'شیرو نے سوال کیا۔

'تو میرا اکلوتا بیٹا ہے، ہر دم یہی ڈر رہتا ہے کہ ابھی تجھے نظر لگی تو ابھی لگی۔۔۔پھر شہر والی چالاک میڈموں سے ڈرتی ہوں۔فیشن کر کر کے میرے بیٹوں کو نہ قابو کرلیں۔'ماں نے اپنی ہمیشہ کی داستان پھر سے شروع کی۔

'ہاں اماں جانتا ہوں۔۔۔پھر یہی کہ کسی شہر والی سے شادی کر لی اور وہیں شہر کا ہو کے رہ گیا، آپ کا پتا بھی نہ کیا کبھی تو وغیرہ وغیرہ۔۔۔'شیرو نے جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

'ایسا کچھ نہیں ہوگا ماں۔۔۔'شیرو نے کہا۔

'اچھا ایک تجھے لڑکی کیسی پسند ہے؟'ماں نے پھر سے گفتگو کا آغاز کیا۔

'ماں۔۔۔شیرو کچھ دیر سوچتا رہا۔۔۔ابھی نہیں۔۔۔'پھر کہا۔

'اچھا سُن۔۔۔یہ شربت پی۔۔۔'ماں نے گلاس اُس کو زبردستی تھماتے ہوئے بولی۔

'جی ماں بولو۔'اُس نے نہ چاہتے ہوئے بھی گلاس کو اپنے ہاتھوں کا سہارا دیا۔

'وہ۔۔۔تیرے راولاکوٹ والے ماموں ہیں ناں؟؟'ماں نے کہا۔

'کون سے؟؟'شیرو نے پوچھا۔

'وہ۔۔۔جن کی تین بیٹیاں ہیں۔۔۔جو ریلوے میں ملازم تھا۔۔۔جب تُو دسویں میں تھا وہ آیا بھی تھا بیوی بچوں کے ساتھ۔۔۔'ماں نے اُسے ہر ممکن یاد دلانے کی کوشش کی۔

'آ گیا یاد!!ماں۔۔۔کیا ہوا اُن کو۔۔۔'شیرو نے پوچھا۔

'اُن کی سب سے چھوٹی بیٹی پسند ہے ماں کو۔۔۔آپ کے لئے۔۔۔'نائلہ نے

کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اعلان کیا۔

'سب سے چھوٹی۔۔۔وہ تو اُس وقت کوئی پانچ چھ سال کی ہوگی۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'بہت خوبصورت تھی، اب تو جوان ہو کے اور حسین ہوگئی ہوگی۔ بالکل ماں پہ گئی ہے۔ گوری چٹی، باپ جیسی لمبی۔۔۔آنکھیں دیکھی تھیں اُس کی۔۔۔ نیلی آنکھیں، ایسی حسین لڑکی۔۔۔نہیں دیکھی میں نے،' ماں نے تفصیل سُناتے ہوئے کہا۔

شیرو نے گلاس ٹیبل پر رکھا۔ کتاب بند کرتے ہوئے سائڈ پر رکھی۔۔۔ پھر نائلہ کی طرف دیکھا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔۔۔'

'ماں۔۔۔۔بہو ہی لانی ہے نا؟؟' شیرو نے پوچھا۔

'ہاں۔۔۔۔ہاں۔۔۔تو وہ۔۔۔کل ہی منشی چا چا کے پوتی ہوئی ہے۔۔۔ بڑے چرچے سُنے ہیں اُس کے میں نے۔۔۔ یہ بھی سُنا ہے کہ آنکھیں بالکل ہیما مالینی جیسی ہیں۔۔۔ گوری چٹی بھی ہے، قد کاٹھ بھی ٹھیک ہے۔۔۔ منگنی کردو۔۔۔دو چار سال میں بڑی ہوجائے گی۔۔۔شادی کر کے لے آنا۔۔۔نائلہ بھی کھیلتی رہے گی۔۔۔اور ماں تم بھی دِل بہلا لینا۔۔۔' شیرو نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

'ارے کمبخت۔۔۔ وہ تو ابھی دو دِن کی بچی ہے۔۔۔ کتنی گھٹیا سوچ ہے تمہاری۔۔۔' ماں نے لعن طعن شروع کردی۔

'تو ماں۔۔۔ ماموں کی بھی بیٹی کوئی بارہ تیرہ برس کی ہوگی۔۔۔ بس۔۔۔!!!' شیرو نے کہا۔

'ہاں۔۔۔تو شادی کرتے کرتے سولہ برس کی ہوجائے گی۔۔۔اِس میں کون سی بات ہے۔' ماں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

'بھائی شیرو۔۔۔ ہے بہت حسین وہ۔۔۔' نائلہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

'گڑیا۔۔۔اُس کے حسن کا میں کیا کروں؟؟' شیرو نے کہا۔

'اے لو۔۔۔کرلو بات۔۔۔لڑکے مرتے ہیں حسین لڑکیوں کے پیچھے۔۔۔تُو تو خود اتنا حسین ہے۔۔۔تیرے مقابلے کی ڈھونڈنی ہے تو ابھی سے شروع کروں گی ناں۔۔۔' ماں نے کہا۔

'اچھا اماں۔۔۔جب نوکری لگ جائے گی ناں۔۔۔تب شادی پہ بات کریں گے۔' شیرو نے ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

'ہمارے لئے تیرے ابا کی یہ دُکانیں اور وہ زمین کافی ہے پُتر۔۔۔تو کیوں کما کما کے ہلکان ہوگا۔۔۔؟' ماں نے شیرو کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

'جیسے تیری مرضی ماں۔۔۔' میں فیکے کی دُکان پہ جارہا ہوں۔شیرو کو معلوم تھا ماں کو قائل کرنا آسان نہیں ہے۔اس لئے جان بچا کے جانے میں ہی آفیت سمجھی۔

....

سورج ڈھلنے کو تھا۔پیپل کے درخت کے نیچے چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر سفید رنگ کی چادریں بچھائی گئی تھیں۔سرہانے کے غلاف پر خوبصورت پھول کڑھے ہوئے تھے۔

درمیاں میں دو حقے رکھے ہوئے تھے۔کبھی حقے کی نالی حسین احمد اپنی طرف موڑ لیتا تو کبھی اکمل دین، مائی ہاجرہ اور کمال شاہ۔ایک دم ایک خاموشی ہوتی تو پرندوں کی چچہاہٹ، ٹیوب ویل سے بہتے پانی کی آواز کے ساتھ ایک اور آواز شامل ہوجاتی جو حقے کے کش لگانے کی تھی۔

مائی ہاجرہ اپنا شیرو آیا ہوا ہے۔' کمال شاہ نے کہا۔

'شیرو۔۔۔وہ شہر والا۔۔۔علی حسین کا بیٹا۔۔۔؟' مائی ہاجرہ نے حقے کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

'ہاں وہی۔' کمال شاہ نے کہا۔

'بڑا روپ والا منڈا ہے۔ سوہنا۔۔۔' رضیہ نے کہا۔

'کوئی شک نہیں بی، ہے بھی نیک طبیعیت۔' کمال شاہ نے کہا۔

'ہاں ہاں۔۔۔ جانتی ہوں' مائی ہاجرہ نے کہا۔

'تو جاناں ذرا، اس کی ماں سے بات کر۔ میری بیٹی بھی جوان ہو رہی ہے۔ اس کو کہنا کہ دونوں بہن بھائی مل بیٹھتے ہیں۔ کس چیز کی کمی ہے میری دھی رانی میں۔ سوہنی ہے، جوان ہے، آٹھ جماعتیں پاس ہے، اب تجھے کیا بتانا، تو تو جانتی ہے۔' کمال شاہ نے کہا۔

'کمالے۔۔۔ وہ نہیں کرے گی۔' رضیہ نے کہا۔

'رضیہ صحیح کہتی ہے کمالے، اسے بڑا گھمنڈ ہے اپنے پتر پہ۔' مائی ہاجرہ نے کہا۔

'مائی ہاجرہ میری بیٹی میں کیا کمی ہے، وہ اکیلی پچاس کلہ کی مالک ہے۔' کمال شاہ نے کہا۔

'اور تو اور ذات برادری بھی ایک ہے دونوں کی۔' اکمل دین نے کہا۔

'ہاں بھائی اکمل ایسا ہی ہے۔' کمال شاہ نے کہا۔

'ناں کمالے تو بات نہیں سمجھ رہا۔ اُسے دولت کی بھلا کہاں کمی۔ اس کی دولت تو اس کا منڈا ہی ہے۔ چل۔۔۔ پھر بھی کرتے ہیں کچھ۔' مائی ہاجرہ نے کہا۔

آسمان پہ ہلکی ہلکی زردی چھا چکی تھی۔ مسجد سے آذان کی آواز بلند ہوئی تو سب نے اپنے اپنے گھر کا رُخ کیا۔ سب پرندے بھی سارا دن کے تھکے ہارے اپنے گھر کی راہ پکڑے ہوئے تھے۔ کمال شاہ بھی حقہ تھامے اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ مائی ہاجرہ اور رضیہ کبھی کسی کا ذکر موضوعِ بحث بناتی تو کبھی کسی کا، اکمل دین بھی سلام کرتا ہوا چل نکلا۔ آذان نے مکمل طور پر فضا کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ شیرو بھی گھر کی جانب جا رہا تھا کہ راستے میں مائی ہاجرہ سے ملاقات ہوئی۔

'سلام پھوپھی!'۔شیرو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

'جوان ہوگیا ہے ماشاءاللہ۔تو تو علی حسین سے بھی زیادہ سوہنا نکلا ہے۔'مائی ہاجرہ نے کہا۔

شیرو ہنسنے لگا۔

'اور سنا پھوپھی باقی سب خیریت ہے۔ بیٹے تیرے باہر ہی ہوتے ہیں؟'شیرو نے پُوچھا۔

'رب کا کرم ہے پتر،سب چنگا۔دو سال پہلے آئے تھے۔اب اگلے سال آئیں گے۔'مائی ہاجرہ نے کہا۔

'چھوٹا والا کیا کرتا ہے؟'شیرو نے پُوچھا۔

'بس وہ بھی باہر جانے کی تیاریوں میں ہے۔'مائی ہاجرہ نے کہا۔

'چل میں چلوں اندھیرا زیادہ ہو رہا ہے۔'مائی ہاجرہ نے کہا۔

'ہاں پھوپھی۔اللہ حافظ۔۔۔'

شیرو نے مائی ہاجرہ کو رُخصت کیا تو ساتھ ہی ایک جانی پہچانی آواز نے شیرو کا نام لیا۔

شیرو نے مُڑ کر دیکھا تو جلیل تھا۔

'اوے یہاں کب سے چھپا ہے؟؟'شیرو نے کہا۔

'تو مائی ہاجرہ سے لمبی گفتگو کر رہا تھا۔اس مائی سے چھپا تھا۔جان ہی نہیں چھوڑتی پکڑ لے تو۔'

اچھا اور سنا۔۔۔'شیرو نے جلیل سے کہا۔

'میں کیا سناؤں شیرو یار۔۔۔تجھے آئے ہوئے تقریباً دس دِن ہوئے ہیں اور اس بار کچھ خاص مزہ نہیں کیا ابھی تک ہم نے۔'جلیل نے کہا۔

'چل پھر رات کو ملتے ہیں۔۔۔' شیرو نے کہا۔

....

'او بھائی شیرو کا ساتھ ہی اتنے مزے کا ہے کہ خاموشی میں بھی شیرو کے ساتھ بیٹھے رہو تو احساس ہی نہیں ہوتا کہ کتنا وقت گزرا اور کتنا بچا۔۔۔ ہر ہر لمحہ قیمتی لگتا ہے' بھولے نے کہا۔

'ہاں شیرو یار۔۔۔! ایسا مزاج تو ہے تیرا۔۔۔لوگ دُور دُور سے کھچے چلے آتے ہیں' رفیق نے کہا۔

'ابے بس کر دو یار۔ شیرو نہ ہو گیا۔۔۔ سائیں ملنگ کا دربار ہو گیا۔۔۔ لوگ دُور دُور سے آئیں' جلیل نے کہا اور سب قہقہہ لگانے لگے۔

'یار ویسے سائیں ملنگ سے یاد آیا۔۔۔ وہ۔۔۔ بابا چراغ دین کدھر ہوتا ہے؟؟ شیرو نے پوچھا۔

'وہ۔۔۔ بابا۔۔۔' یہ کہہ کر جلیل ہنسنے لگا۔۔۔

'بھائی شیرو خیر ہو۔۔۔ بابا فقیر دین کے پاس جانتے ہو کون لوگ جاتے ہیں۔۔۔'؟ رفیق نے کہا۔

'اوہو۔۔۔ میں نے بس پوچھا ہے کہ کہاں ہوتا ہے۔۔۔ جانا نہ جانا بعد کی بات ہے۔' شیرو نے کہا۔

'وہ کبھی مائیں سیانی کی درگاہ پہ تو کبھی بابا فقیرے کے مزار پہ۔۔۔ کل اماں بتا رہی تھی کہ وہ رات کا کھانا کھانے اکثر۔۔۔ وہ کمالا ہے ناں؟؟؟' بھولے نے کہا۔

'کون کمالا؟؟'۔۔۔ شیرو نے پوچھا۔

'وہ جس کی زمینیں ہیں اڈے والے کھو کے پاس۔۔۔ حسن محمد کا بیٹا۔۔۔'

رفیق نے کچھ اور یاد دلایا۔۔۔

'ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔وہ ریاض لکڑی والے کا بہنوئی۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'اُس کے اولاد نہیں تھی بارہ سال سے۔۔۔بابا چراغ دین کی دعا سے ایک ماہ پہلے پُتر ہوا ہے۔۔۔آج کل اُس کے گھر سے کھانا کھاتا ہے۔۔۔۔بڑی ضد کر کے وہ بابے کو گھر لے کر جاتا ہے'۔

رفیق نے کہا۔

'اچھا۔۔۔بڑا پہنچا ہوا ہے بابا چراغ دین پھر تو' ۔شیرو نے کہا۔

'سُنا تھا کہ بابا فقیرا اس کو کوئی دعا دے گیا تھا' ۔بھولے نے کہا۔

'ہاں اس نے خدمت بھی تو بہت کی ناں بابا جی کی۔۔۔' رفیق نے کہا۔

'بس بندہ بشر ٹھوکر مارے ناں تو رب ہی یاد آتا ہے۔۔۔بس سُن رکھا ہے کہ ایک دِن روتا ہوا بابا کے قدموں میں آ گرا۔۔۔بہت رویا۔۔۔پھر بابے کا مُرید بن گیا اور آہستہ آہستہ سائیں۔۔۔' جلیل نے کہا۔

'ویسے خیر ہے شیرو؟؟ کوئی دُعا شعا تو نہیں لینی پڑ گئی'؟ جلیل نے پوچھا۔

'نہ نہ۔۔۔شیرو نے کہا۔'ویسے ہی ملنے کو جی کیا' ۔اُس نے مزید کہا۔

'چل۔چل لینا کسی دِن۔۔۔ ملوادیں گے اس میں کون سی بڑی بات ہے۔' جلیل نے کہا۔

'چل بھولے چار پائیاں سمیٹیں۔۔۔پھر نکلتے ہیں۔۔۔' رفیق نے کہا۔

'ہاں رات بھی بہت ہوگئی ہے۔۔ دیکھ کالے بادل۔۔۔لگتا ہے کہیں بارش ہورہی ہے۔۔۔اِدھر بھی ہونے والی ہے۔' جلیل نے کہا اور سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔

....

کہوٹہ

تیز ہواؤں نے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ اُس کے گھر کی کھڑکیاں دروازے کبھی کُھلتے تو کبھی آندھی کے زور سے بند ہوتے۔۔۔ کھڑکیاں کُھلی ہونے کے باعث تیز ہوا اُس کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی اور کمرے میں موجود تمام چیزوں کو اپنے زور سے جگہ بدلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ سارے گھر کی کھڑکیاں بند کرتی ہوئی وہ آخر میں اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔۔۔

'اُف۔۔۔۔ یہ کیا۔۔۔' اُس نے کہا۔

تیز ہوائیں خود پہ قابو پا چکی تھیں۔ اب بارش کی باری تھی۔ ہلکی ہلکی بوندوں سے شروع ہونے والی رِم جِھم تیز طوفانی بارش کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اُس نے فوراً کھڑکی بند کی اور چیزیں سمیٹتے ہوئے لیمپ کے پاس موجود کُرسی پر بیٹھ گئی۔۔۔ بیگ سے ایک کاغذ نکالا اور پھر سے کہا 'کیا کروں؟' اور مُسکرانے لگی۔

'وہاں کا موسم کیسا ہے؟؟' اُس نے کاغذ کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

'اچھا ہی ہوگا۔۔۔ تم جو ہو وہاں۔۔۔۔' خود ہی جواب دیا۔

'گرمی ویسے بہت ہوگی۔۔۔ دن میں۔۔۔ دھوپ بھی تیز ہوگی۔۔۔ بجلی بھی نہیں ہوتی۔۔۔ پھر کیا کرتے ہوگے؟؟' اُس نے کہا اور اب کی بار ہنسنے لگی۔۔۔

'نازلی بیٹا۔۔۔ کھڑکیاں سب بند ہیں۔۔۔؟؟' یہ اُس کی ابا کی آواز تھی۔

'جی بابا۔۔۔ سب بند کر دی ہیں۔۔۔ فکر نہ کریں آپ'۔۔۔ کاغذ کو پھر سے بیگ میں ڈالا اور چیزیں سمیٹنے لگی۔

چیزیں سمیٹتے سمیٹتے ایک کتاب ہاتھ لگی۔۔۔ 'لو جی۔۔۔' اُس نے کہا۔۔۔

'تمہاری کتاب۔۔۔۔ اب میرا کیا قصور۔۔۔ تمہاری چیزیں۔۔۔ خود ہی میرا

پیچھا کرتی ہیں۔۔۔' اور کتاب کو دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لیتے ہوئے ایک گہری سوچ میں گُم ہوگئی۔۔۔۔

اور پھر مُسکراتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔آخر کیوں آئی ہو میرے پیچھے۔ پھر ہنسنے لگی۔۔۔ٹھیک ہے۔۔۔تمہارے مالک کو تمہاری موجودگی کی اطلاع دے دیتے ہیں۔اسی بہانے اُس کی خیر خبر بھی معلوم کرلیں گے۔' وہ ایسی ہی تھی خود سے باتیں کرنے والی، معصوم سی نازلی۔

کتاب کو سائڈ ٹیبل پر رکھا اور نوٹ پیڈ اُٹھا کر خط لکھنا شروع کیا۔

ہاں تو۔۔۔ کیا کہوں تمہیں۔۔۔۔ جناب۔۔۔!!نہیں۔۔۔۔سر۔۔۔ نہیں۔۔۔صرف مشراز۔۔۔۔نہیں اچھا نہیں لگتا۔۔۔۔ایسا کرتی ہوں۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں لکھتی۔۔۔۔بس لکھتی ہوں۔۔۔۔سنو۔۔۔۔کیسے ہو؟؟' وہ مُسکرائی۔۔۔

کچھ تو لکھنا شروع کروں۔۔۔۔

'مشراز صاحب۔۔۔ کہیے کیسے مزاج ہیں؟؟'۔۔۔یہ ٹھیک ہے۔۔۔اُس نے لکھتے ہوئے خود سے کہا۔

'اُمید ہے گھر میں بھی سب خیریت سے ہوں گے'۔۔۔اُس نے لکھا۔

پھر سوچنے لگی۔۔۔'جی میں آیا تم سے ملوں۔۔۔۔سو چا خط لکھا جائے۔۔۔خط بھی تو آدھی ملاقات ہی ہوتا ہے نا۔۔۔سو میں ملنے آگئی۔۔۔' کاش یہ سب لکھ سکتی۔۔۔وہ مُسکرائی۔۔۔چلو تھوڑا سا پروفیشنل انداز میں لکھتے ہیں۔۔اُس نے خود سے کہا اور خط لکھنا شروع کیا۔

'سنو مشراز!!۔۔۔ اوہو۔۔۔ یہ کیا لکھ دیا۔۔۔!! وہ بے اختیار خود پہ ہنسی۔۔۔۔اور خود سے کہنے لگی۔۔۔۔ کیا نازلی۔۔۔۔اُف۔۔۔۔ ایک خط نہیں لکھ سکتی۔۔۔۔خط نہ ہوگیا سو نمبر کا پرچہ حل کرنا ہوگیا'۔

اپنی ہی بات پر کچھ دیر کو رُکی اور کہنے لگی۔۔۔ یہ۔۔۔۔ جن چکروں میں پڑ رہی ہوں وہ بھی کسی امتحان سے کم نہیں ہیں۔۔۔ یہ امتحان ہی تو ہے۔۔۔۔ بلکہ امتحان کا آغاز ہے۔۔۔ ایک اہم آغاز جس نے انجام کا فیصلہ خود ہی کرنا ہے۔۔۔۔ جواب آ گیا تو میں جیت گئی۔۔۔ نہ آیا تو سمجھوں گی کہ تمہیں خط موصول ہی نہیں ہوا۔۔۔ دیکھا کتنی ذہین ہوں میں، ہار پھر بھی نہیں مانوں گی۔ اُس نے خود سے کہا۔۔۔'

'نازلی ظفر۔۔۔۔ محبت کرنا تو انجام کی پرواہ نہ کرنا۔۔۔۔ نتائج سے نبرد آزما ہو کر محبت کرنا، جب بھی کرنا۔ چاہے کچھ دیر کے لئے ہی کرنا۔۔۔' اُس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

سلام مشراز۔۔۔ کیسے ہو؟ اُمید ہے خیریت سے ہو گے اور چھٹیاں بھی بہترین گزار رہے ہو گے۔ خط اس لئے لکھ رہی ہوں کہ بتا سکوں تمہاری کتاب میرے پاس محفوظ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سمجھو کسی نے چُرا لی ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔۔۔۔ یہ لکھ کر وہ مُسکرائی۔۔۔ عموماً ایسے رسمی جملوں کا استعمال وہ کم کرتی تھی مگر جب بھی کرتی تھی، دِل سے ان کے معنی سمجھتے ہوئے کرتی تھی۔۔۔ آج بھی اُس نے یہی کیا اور خط کا اختتام اپنے مخصوص الفاظ پر کیا۔۔۔ 'ربِ کعبہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے'۔۔۔ آمین۔۔۔

لو آج بارش بھی ختم ہو گئی اور پتا بھی نہیں چلا۔۔۔۔ جب تمہارا ذکر ہوتا ہے بادل آنے کا معلوم ہوتا ہے نہ برسات کی خبر۔۔۔ ہوش اُڑا دینے والی بارش۔۔۔ بلکہ طوفان تھا۔۔۔۔ تمہاری ایک کتاب نے دیکھو وقت کی خبر بھی نہ ہونے دی، سوچو پھر۔ جناب مشراز علی۔۔۔ تمہاری موجودگی میرے، حواس کا کیا حشر کرتی ہو گی۔۔۔ وہ بے اختیار کھلکھلا اُٹھی۔

....

گوکھووال (فیصل آباد)

'یہ لالٹین سائڈ پہ رکھ' جلیل نے کہا۔

'کیا بات ہے یار۔۔۔اتنی دیر لگا دی، اب تو محفل ختم ہونے والی تھی'۔رفیق نے جلیل سے پوچھا۔

'ارے یار میں چودھریوں کے کھو پہ انتظار کر رہا تھا۔کسی نے بتایا ہی نہیں آج ڈیرہ ادھر لگنا ہے۔ویسے اونچائی سے سبزہ دیکھنے کا کتنا مزہ آتا ہے ناں؟' جلیل نے کہا۔

'یہ تو کچھ بھی نہیں یار۔۔۔۔شہر میں تو میرے کالج کی چھت سے پورا لاہور نظر آتا ہے۔مصنوعی روشنیاں الگ اور چاند تارے الگ روشن۔۔۔مشراز نے ہنستے ہوئے کہا۔

'یار شیرو۔۔۔کبھی چاند نہ نکلا ہو نہ تو خود چھت پہ جا کہ کھڑا ہو جایا کر، شہر والے پاگل ہو جائیں گے'۔سب نے ایک قہقہہ لگایا۔

'او یار کبھی تو بس کر دیا کرو'۔مشراز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

'او سُن تو ہم میں سے۔۔۔ بلکہ پورے گاؤں کا واحد پڑھا لکھا شخص ہے، سونے پہ سہاگا۔۔۔حسین اتنا کہ نظریں تجھ پہ رُکیں، سمجھدار اتنا کہ پنڈ کا چودھری بھی مجھے لگتا ہے ایک دن تجھ سے مشورے لیا کرے گا' رفیق ہنسنے لگا۔۔۔

'تجھے بُرا نہیں لگتا سب مشراز سے تجھے شیرو کہتے ہیں۔۔۔۔ساری پرسنیلٹی خراب ہو جاتی ہے تیری'۔بھولے نے کہا۔

'نہیں یار۔۔۔بچپن کے یار ہو۔۔۔شیرو، میرو، خیرو جو بھی کہو مجھے تو اپنا پن لگتا ہے۔۔۔مشراز نے کہا۔

'شیرو یار ایک بات سُن۔۔۔۔یہ جو اپنا فیکا ہے نہ۔۔۔۔اِس نے دو دن صابن

سے منہ دھویا۔۔۔خوشبو والے صابن سے۔۔۔۔اور۔۔۔۔چار دِن اکڑ کے چلتا رہا۔۔۔ کسی سے بات نہیں کی۔۔۔۔، جلیل نے کہا اور سب نے قہقہہ لگایا۔

'وہ کیوں یار۔۔۔؟'مشر از نے پوچھا۔

'وہ اِس لئے کہ۔۔۔۔سمجھ رہا تھا رُوپ بڑا آ گیا ہے۔۔۔اِس نے تو وہ درزی کی نواسی سے بات چیت بھی ختم کر دی تھی کہ اُس کی سہیلی زیادہ حسین ہے۔۔۔اب اُس سے کروں گا۔۔۔'

جلیل نے کہا۔

'او بس کر دیا کرو یار۔۔۔'رفیق نے چڑتے ہوئے کہا۔

'یار شیرو۔۔۔ان کی باتوں میں نہ آیا کر'۔۔۔رفیق نے کہا۔

'یار وہ جو ہیر تھی نہ۔اُس نے خود خط لکھا تھا اور تحفہ بھجوایا تھا خوشبو والا صابن۔پھر مصروف رہا چار دِن دوکان پر کہ نہیں مِل سکا ان سے تو انہوں نے چھیڑ ہی بنالی۔'رفیق نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

شیرو سب کی باتوں کے مزے لے رہا تھا۔

'اُس نے دِل لگی کی اور تُو سمجھا کہ تجھے سچ مُچ کی ہیر مِل گئی۔۔۔بھولے نے کہا اور ہنسنے لگا۔

'یار بھولے تُو بولتا کبھی کبھی ہے مگر بولتا کمال ہے'۔جلیل نے کہا اور قہقہہ لگایا۔

'او سچی مچی کی ہیر تو اپنے شیرو کی ہے'۔جلیل نے کہا۔

'مجھے لگتا ہے تو شہر سے ہی بھابھی لے کر آئے گا'۔رفیق نے کہا۔

'بھابھی نہ بول۔۔۔بول ہیر ویر سی۔۔۔بس جو دِل کو بھا جائے وہی میری ہیر۔۔۔'شیرو نے کہا۔

'چاہے ہو قیس کی لیلی جیسی۔۔۔'رفیق نے کہا۔

'ہاں جی۔۔۔لیلی بھی چلے گی۔۔۔ جووی ہو۔ ہووے ایک تے ہووے وی اپنی۔۔۔'شیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

'بھائی شیرو دیکھ لے تُو بھی طعنے مار رہا ہے'۔رفیق نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

'نہ فیکے۔۔۔ اپنے دِل کی بات بتا رہا ہوں۔۔۔شیرو نے جلیل کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔۔۔خود ہی تو کہتا ہے کہ تُو دِل کی باتیں نہیں بتاتا۔آج بتا رہا ہوں تو تُو سُن نہیں رہا۔'شیرو نے کہا۔

'ایک کی آس پہ نہ رہنا۔۔۔بابے چراغ دین کا حال دیکھ لے۔۔۔'رفیق نے کہا۔

'تو تُو اس حال سے ڈر کر یہ سب کرتا ہے۔۔۔ مجھے لگتا ہے تُو نے ویسے ہی پاگل ہو جانا ہے۔۔۔روز ایک نئی لڑکی کو پھنسا کے۔۔۔گاؤں والوں نے جوتا اُٹھانا ہے۔۔۔تجھے کھوتے پہ بٹھانا ہے اور پھر ٹھو کے سات چکر لگوانے ہیں۔۔۔ جب تیری رسیاں کھولیں گے تب تو نے کُھلتے ہی دھمالیں ڈالنا شروع کر دینی ہیں۔'بھولے نے کہا۔

'بس کر بس بھولے۔۔۔ ہمارے ہنس ہنس کے پیٹ میں بَل پڑ گئے ہیں۔'جلیل نے ہنستے ہوئے کہا۔

'کرنے دے جو کرتا ہے۔۔۔ نہ تنگ کرو۔۔۔' شیرو نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

'بکواس نہ کر یار۔۔۔دو ویلوں کا ایک ویلہ ہے۔۔۔کوئی اچھی بات کر'۔رفیق نے کہا۔

اوئے سُن۔۔۔آج چاند کی پہلی رات ہے ناں۔۔۔؟' جلیل نے سرگوشی کی۔۔۔

سب دوست قریب آ گئے اور یک زبان ہو کر کہا۔۔۔'ہاں۔۔۔ کیوں؟'

'سُنا ہے آج بابا چراغ دین کہیں جاتا ہے اور دو دِن بعد واپس آتا

ہے۔۔۔' جلیل نے آہستہ سے بتایا۔

'تو نے چاچے کے ساتھ جانا ہے؟؟' بھولے نے ہنستے ہوئے کہا۔

'آہستہ بول۔۔۔ چاچا کے جن سُن نہ لیں۔' جلیل نے کہا۔

بھولے نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔۔۔'نہ چا چا نہ۔۔۔ میں تو چاچا کرموں کی بات کر رہا تھا۔' سب ہنسنے لگے۔

'اچھا تو بتا جلیل۔۔۔ تُو چاچے کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا۔۔'؟ شیرو نے پوچھا۔

'میں کہہ رہا تھا کہ چل۔۔۔ آ چل کے دیکھتے ہیں۔۔۔ چاچا کہاں جاتا ہے۔۔۔' جلیل نے کہا۔

'بس یار۔۔۔ جو گیا واپس نہیں آیا۔۔۔ وہ مائی بشیراں کا بیٹا تھا۔۔۔ ہیرو بننے گیا اور مَلکوں کے کنویں سے اس کی نعش برآمد ہوئی۔۔۔ پُورے مہینے بعد۔۔۔' رفیق نے کہا۔

'او سب باتیں ہیں یار۔۔۔ میں نے سُنا تھا اس کی دشمنی تھی کسی سے۔۔۔ موقع ملتے ہی مار دیا اور نام لگا دیا۔۔۔ باہر کی چیزوں کا۔۔۔' جلیل نے کہا۔

'ہاں سُنا تھا، اُس کی کوئی دشمنی تھی۔ مَلکوں کی کُڑی (لڑکی) سے کوئی چکرو کر تھا۔۔۔ بس یہ چکروں والے ایسے تو مَرتے ہیں۔۔۔' بھولے نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

شیرو نے اُس کا ساتھ دیا۔۔۔'ہاں اماں بتا رہی تھی کہ اُسکی دشمنی تھی وغیرہ وغیرہ۔۔۔ ٹھیک کہہ رہا ہے بھولا۔۔۔' شیرو کن اکھیوں سے بھولے کو دیکھنے لگا۔

'تم لوگ جاؤ۔۔۔ میں نہیں جاؤں گا۔۔۔' رفیق نے کہا۔

جلیل نے رفیق کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔۔۔'او آہستہ بول۔۔۔ کوئی

سن نہ لے۔

'ابھی نکلیں۔۔۔؟ شیرو نے پوچھا۔۔۔

'ہاں شیرو۔۔۔ابھی نکلتے ہیں۔۔۔بس ایک لالٹین رکھ لو۔۔۔خیال رکھنا۔۔۔ لالٹین بس ضرورت کے وقت جلانی ہے۔' جلیل نے کہا۔

'بھولے۔۔۔تُو چلے گا؟؟' شیرو نے پُوچھا۔

'ہاں سرکار۔۔۔یاروں کو اکیلا کیسے چھوڑ دوں۔۔۔' بھولے نے کہا۔

'رفیق یار تجھے گھر چھوڑتے ہیں۔۔۔یہ نہ ہو کوئی تیری تاک میں بیٹھا ہو اور جیل بابا چراغ دین کاٹے۔۔۔' جلیل نے سنجیدگی سے کہا پھر بھولے اور شیرو کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔

'میں نے صبح دوکان کھولنی ہے۔ابا گھر سے غائب پا کر ویسے ہی آگ بگولہ ہو جائے گا۔ورنہ میں ڈرتا ورتا نہیں ہوں کسی سے۔' رفیق نے کہا۔

'ہاں۔۔۔ہم جانتے ہیں۔' تینوں نے یک زبان کہا۔

'چل آ۔۔۔نیچے اُتر۔۔۔' شیرو نے رفیق سے کہا۔

گاؤں کی تنگ گلیوں سے ہوتے ہوئے وہ اڈے پر پہنچے۔وہاں سے رفیق کو اُس کے گھر کی طرف روانہ کیا اور خود بابا فقیرے کی درگاہ کا رُخ کیا۔اڈے سے رستہ سیدھا کھیتوں کی طرف جاتا ہے۔۔۔آسمان پر تارے ہی تارے تھے چاند بس ایک ہلکی سی کمان کا نشان بنائے ڈھونڈنے پر نظر آتا تھا۔۔۔چاروں طرف لہلہاتا سبزہ۔۔۔وہ تینوں سبزے میں سے ہوتے ہوئے درگاہ کی جانب رواں دواں تھے۔جب ہوا چلتی تو پانی سے ہوتی ہوئی لمبے لمبے سبزے کو چُھو کر ان سے ٹکراتی تو ایک ٹھنڈک اور تازگی کا احساس ہوتا۔۔۔

'یار جلیل۔۔۔یہ ٹھنڈی ہوا۔۔۔تاروں سے بھرا آسمان۔۔۔یہ دیکھ لہلہاتا ہوا

سبزہ۔۔۔ مجھے بہت پسند ہے۔ جب یہ سب شہر میں یاد آتا ہے تو بہت اُداس ہوتا ہوں۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'ہاں بھائی شیرو۔۔۔ چاند تو تجھے ویسے ہی بہت پسند ہے۔' جلیل نے کہا۔

'چاند کی تو بات ہی کیا ہے۔۔۔ اِسی لئے تو آج چھت پہ چڑھ کے بیٹھے تھے۔' شیرو نے جواب دیا۔

'مگر یہ چاند تو کُھلے میدان میں بھی نظر آتا ہے۔۔۔' بھولے نے کہا۔

'اِسی لئے تو تجھے سب بھولا کہتے ہیں۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'پہلی بات تو یہ کہ کُھلے میدان میں تو روز ہم چاند دیکھتے ہیں اور یہ پہلی کا چاند ہوتا ہے اِسے غور سے دیکھنا پڑتا ہے۔۔۔ دوسری بات یہ کہ چھت ذرا زیادہ قربت کا احساس ہوتا ہے۔۔۔ میدان پہ تو لگتا ہے کہ چاند پتہ نہیں کتنا دُور ہے۔ چھت پہ چڑھو تو ایسا لگتا ہے کہ ہاتھ بڑھا کر ابھی چُھو سکتا ہوں۔۔۔' شیرو نے جواب دیا۔

'نہ یار نہ۔۔۔ چُھونے کی بات نہ کر۔۔۔ لوگ اس کی عبادت کرتے ہیں۔۔۔ جن کو پوجا جاتا ہے، ان کو چھویا نہیں جاتا۔۔۔' جلیل نے کہا۔

'کیا بات کر دی ہے یار جیلے۔۔۔ کمال ہو گیا۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'بس یار۔۔۔ کبھی کبھار آ جاتی ہے دِل میں ایسی بات۔۔۔' جلیل نے کہا۔

'پر شیرو، جیلے۔۔۔ اب کہاں لوگ چاند کی عبادت کرتے ہیں۔۔۔' بھولے نے پُوچھا۔

'ارے بھولے۔۔۔ بھولے ہی رہنا۔۔۔' جلیل نے کہا۔

'اس عبادت کا مطلب۔۔۔ عشق عبادت ہے یار۔۔۔ مطلب۔۔۔ جن سے عشق کیا جاتا ہے۔۔۔ ان کو چھونے کی تمنا کرنا بھی جرم ہے۔۔۔' شیرو نے سمجھایا۔۔۔

'تو کیا تمہیں چاند سے عشق ہے؟؟' بھولے نے کہا۔

'چاند میں ایسی کیا بات ہے وہ بھی پہلی کا۔۔۔ چاند تو ہوتا ہے چوندھویں کا۔۔۔' بھولے نے مزید کہا۔

'چودھویں کا چاند تو ہر ایک کو پسند ہوتا ہے۔۔۔ پورا جو ہوتا ہے۔۔۔ مکمل !!! بات تو تب ہے جب کوئی ادھوری چیز کو چاہے اور اپنی چاہت سے اُسے مکمل کرے۔' شیرو نے کہا۔

'ہیر کے حسن کے قصے تو ہر جگہ مشہور ہیں، رانجھا بھی اپنے دور کا حسین تھا۔۔۔ پھر وہ رومیو۔۔۔ جولیٹ۔۔۔ حسن کے بادشاہ۔۔۔ پھر وہ سسی۔۔۔ اسکا پنو۔۔۔ یہ کوئی عاشق تو نہیں تھے۔۔۔ یہ تو حسن کے دیوانے تھے۔۔۔ یہی اگر سسی کے حسن کا چرچا نہ ہوتا تو پنو اُس سے ملنے اتنی دُور کہاں جاتا۔۔۔ پُنو حسین نہ ہوتا تو سسی بھلا اُسکی طرف دیکھتی بھی؟' شیرو نے کہا۔

'نہ یار نہ۔۔۔ کبھی نہ۔۔۔' جلیل نے کہا۔

'بھائی شیرو تو جوفیکا ہر دوسرے دِن عشق کر بیٹھتا ہے وہ۔۔۔؟ بھولے نے ہنستے ہوئے کہا۔

شیرو اور جلیل دونوں نے قہقہہ لگایا۔ یار بھولے وہ تو بس ایک دو دِن کی باتیں ہیں۔۔۔ یہ کوئی عشق وشق تو نہیں۔۔۔ یہ تو بس۔۔۔ ایسے ہی۔۔۔ وقت گزاری۔۔۔ ذرا سمجھ آنے دو۔۔۔ ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ جلیل نے کہا۔

'بابا فقیرے کا مزار کتنی دُور ہے؟؟' شیرو نے پُوچھا۔

'بس یار۔۔۔ اگلی فصل سے ہوتے ہوئے۔۔۔ دائیں جانب ایک کنواں ہے۔۔۔ اُس کے پیچھے۔۔۔' جلیل نے کہا۔

'ایسا کرو اب۔۔۔ لالٹین بجھا دو۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔' جلیل نے کہا۔

'یار شیرو۔۔۔ویسے سسی اور پنوں میں ان کا قیدو کون تھا؟؟' جلیل نے پُوچھا۔
شیرو نے قہقہ لگایا قیدو کس نے ہونا تھا۔۔۔زمانہ تھا قیدو۔۔۔اُس نے ہنس کر رہا۔۔۔
'کبھی وقت ہوا تو تفصیلاً سناؤں گا ان کا قصہ۔۔۔' شیرو نے کہا۔
'وہ دیکھو بابا فقیرے کی درگاہ' ۔شیرو نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
'کہاں۔۔۔یار جلیل۔۔۔'؟ شیرو نے پوچھا۔
'یار وہ جہاں سبز چادریں لٹکی ہیں۔۔۔اور وہ کنواں۔۔۔' بھولے نے اشارے سے سمجھاتے ہوئے کہا۔
'یہ تو بس ایک قبر ہے چھوٹی سی۔۔۔' شیرو نے کہا۔
'ہاں بھائی شیرو۔۔۔یہ مٹی سے چادر دیواری بھی گاؤں کے لوگوں نے کی ہے۔ اور یہ کنواں۔۔۔بہت مشہور ہے، اماں بتاتی تھی کہ کوئی بھی منت مراد ہو تو اس کنویں کے کنارے ایک پیالہ پانی کا بھر کے ساتھ ایک پاؤ دانے ڈال دو۔۔۔اور درگاہ پہ آ کر دعا کر لو۔۔۔جو مُراد بھی ہو پُوری ہو گی' ۔جلیل نے کہا۔
'چل تھوڑی دیر ادھر بیٹھتے ہیں۔۔۔بابا چراغ دین نکلنے والا ہو گا' ۔جلیل نے کہا۔
'ویسے کیا واقعی درگاہ پہ آنے سے لوگوں کی مُراد پُوری ہوتی ہے؟' شیرو نے کہا۔
'پتہ نہیں یار۔۔۔سُن تو یہی رکھا ہے۔۔۔تو ٹھہرا شہر کا لڑکا۔۔۔ہم گاؤں کے پینڈو۔۔۔ہم نے تو یہی سُنا ہے' ۔جلیل نے کہا۔
'میرا ماننا ہے کہ جہاں مرضی بیٹھ کے مانگو۔۔۔دِل کی دعا کبھی رَد نہیں ہوتی۔ بس ہر چیز کا وقت ہوتا ہے۔جیسے سسی اور پنوں کا وصال تھا ملے بھی مگر پھر جُدا ہو گئے۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'ایک طرف تو کہتا ہے کہ وہ عشق بھی کوئی عشق تھا وہ ایک دوسرے کے حُسن کے دیوانے تھے اور عشق کا حُسن نے کیا واسطہ۔۔۔۔دوسری طرف اُن کی محبت کی مثالیں دیتا ہے' جلیل نے کہا۔

'میرے کہنے سے کیا ہوتا ہے یار جیلے ۔۔۔دُنیا تو مانتی ہے ناں۔۔۔۔تبھی تو ابھی تک ان کا نام زندہ ہے' شیرو نے کہا۔

'ویسے چاہے اُن کے عشق کی بنیاد حسن ہی تھی ۔۔۔ پر ان کا ملن، ان کا صبر اور ان کی لگن کمال تھی۔' جلیل نے کہا۔

'ہاں ۔۔۔ہوگی ۔۔۔' شیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

'وہ دیکھو یار۔۔۔ چراغ روشن ہوا۔۔۔' بھولے نے کہا۔

'خاموش ہو جاؤ۔۔۔ اب آہستہ آواز میں بات کرنا۔۔۔بابا چراغے کے کان بہت پتلے ہیں۔' بھولے نے کہا۔

کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹا سا میدان جہاں دائیں جانب کنواں تھا۔ اس کنویں میں ڈھیروں سوکھے اور پانی سے بھرے پیالے موجود تھے۔ ساتھ جگہ جگہ پرندوں کے لئے دانہ پڑا ہوا تھا۔ بابا چراغ دین ایک درخت کے نیچے سے اُٹھا۔۔۔ ہاتھ میں چراغ اُٹھائے وہ کنویں کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ تینوں خاموشی سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔۔۔ بابا چراغ دین نے وہ چراغ کنویں کے کنارے رکھا اور اس سے باقی دیئے روشن کرنے لگا۔ اب درگاہ پر کافی روشنی تھی۔ بابا چراغ دین کا چہرہ آسانی سے نظر آرہا تھا۔ سر پر سفید بال۔۔۔ چہرے پہ بڑھاپے کے واضح آثار تھے۔ جھریوں نے چہرے کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔۔۔آنکھیں اتنی موٹی تھیں کہ اتنی سی روشنی میں بھی نمایاں ہو رہی تھیں۔

'شیرو دیکھ یار، ہے تو بابا میرے جیسا کالا سیاہ۔۔۔ مگر کشش دیکھ تُو۔۔۔' بھولے نے ہنستے ہوئے کہا۔

'او تیری۔۔۔ چُپ کر یار۔۔۔' شیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔۔۔

ایک کُھلے سے سیاہ چوغے میں، سیاہ دھوتی باندھے بابا چراغ دین گلے میں ڈھیروں ڈھیر منکے، موتی اور مالائیں لٹکائے ہوئے تھا۔۔۔ آنکھوں کی اُداسی واضح تھی۔۔۔ مگر پھر بھی آنکھوں کی چمک اس اُداسی پر حاوی تھی۔۔۔ ہاتھ کی پانچوں انگلیوں میں مختلف نگوں والی انگوٹھیاں تھیں۔۔۔

'یار بابا کے ہاتھ میں انگوٹھیاں تو بہت قیمتی ہیں۔۔۔ شیرو نے کہا'۔

'یار۔۔۔ ہم نے کبھی ایسی باتیں نہیں سوچیں۔۔۔ ہم تو بابے کو دُور سے دیکھ کے ہی احترام میں ہاتھ باندھ لیتے ہیں۔۔۔ یہ تو تیری دی ہوئی شہ ہے کہ آج ہم بابے کی جاسوسی کر رہے ہیں۔۔۔' جلیل نے ہنستے ہوئے کہا۔

'بابا درگاہ سے نکل رہا ہے۔۔۔' بھولے نے کہا۔

'بس دھیان رکھنا گُم نہ جائے اور اپنا لالٹین نہ جلانا۔۔۔ بابا چراغ کے پیچھے ہی چلنا' جلیل نے کہا۔

'ہاں ٹھیک ہے۔۔۔' دونوں نے جواب دیا۔

....

کہوٹہ

'اُٹھ جاؤ بیٹا نازلی وقت دیکھو زرا۔۔۔' نازلی کے ابا نے آواز دیتے ہوئے کہا۔

ایک تو یہ لڑکی بھی ناں۔۔۔ جب سے آئی ہے وقت برباد کر رہی ہے۔۔۔ ہزار بار کہا خود کو مصروف رکھا کرو۔ کوئی کام وام کیا کرو مگر مجال ہے کہ میری بات سُنے۔

'اُٹھ گئی ڈیڈی۔۔۔' نازلی نے آواز لگاتے ہوئے کہا۔

'اب اُٹھنے کا کیا فائدہ۔۔۔ وقت دیکھا ہے۔۔۔' نازلی کے ابا نے کہا۔

'نازلی نے چادر واپس منہ پر لیتے ہوئے کہا۔۔۔اوکے ڈیڈی پھر سو جاتی ہوں۔۔۔جیسے آپ کہیں۔۔۔'نازلی ہنستے ہوئے کہا۔

نازلی کے ابا صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگے۔۔۔'بیٹا۔۔۔جو بھی کہتا ہوں تمہارے بھلے کے لئے کہتا ہوں۔۔۔یہ سب کچھ تمہارا ہی تو ہے،اور کس نے دیکھنا ہے۔'

'جی ابا جان۔۔۔دُرست فرمایا آپ نے۔۔۔'نازلی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔اور ہیڈ بورڈ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

'بس یہی طریقے ہیں تمہارے۔۔۔جی ابا جان۔۔۔جی ڈیڈی جان۔۔۔جی بابا جان۔۔۔جی جی اور بس جی۔۔۔کوئی عمل نہیں کرتی۔۔۔'ابا نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

'کیا چاہتے ہیں آپ۔۔۔کہ میں آفس جاؤ۔۔۔اچھا وعدہ۔۔۔اگلی چھٹیوں میں آفس سنبھال لوں گی۔۔۔'نازلی نے کہا۔

'پچھلی چھٹیاں بھی یہی کہا تھا۔۔'ابا نے کہا۔

'پر وعدہ نہیں کیا تھا۔۔'نازلی نے سنجیدگی سے کہا۔

'اب بس باتیں نہ بناؤ۔۔۔اور آؤ۔۔۔کھانا لگنے والا ہے۔۔۔جلدی نیچے آؤ۔'نازلی کے ابا نے کہا۔

'کھانا۔۔۔ابھی تو مجھے ناشتہ کرنا ہے۔'نازلی کے کہا۔

'ناشتے کا ٹائم ختم۔۔۔بس کھانا کھاؤ آ کر۔۔۔'نازلی کے ابا نے حکم جاری کیا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔'

....

گوکھووال (فیصل آباد)

'جانا ئلہ۔۔۔ بھائی کو اُٹھا۔۔۔دوپہر ہوگئی ہے۔۔۔'اماں نے نائلہ کو آواز

دی۔

'مجھے تو اماں تم سورج نکلنے کے بعد سونے نہیں دیتی۔۔۔' نائلہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

'میرا شہری بیٹا۔۔۔ میں صدقے۔۔۔ ساری عادتیں شہروالی ہیں۔۔۔' اماں نے بڑے فخر نے کہا۔

'واہ بھئی واہ۔۔۔ عجیب باتیں ہیں۔' نائلہ نے کہا۔

'ارے رُک۔۔۔ پانی کا تسلہ لیتی جا ساتھ۔۔۔ ساتھ ہی منہ دُھلوادینا۔۔۔ میں اُتنی دیر میں لسی بناتی ہوں۔۔۔' اماں نے کہا۔

'ہاں بیٹے کو تو لسی بھی پلنگ پہ۔۔۔' نائلہ بڑبڑاتی ہوئی شیرو کو جگانے کے لئے چلی گئی۔

'بھائی شیرو۔۔۔ اُٹھ جاؤ ورنہ سارا پانی اوپر گرادوں گی۔۔۔' نائلہ نے اعلان کیا۔

'بھائی آخری بار کہہ رہی ہوں۔۔۔' نائلہ نے پھر سے کہا۔

'ہاں گُڑیا۔۔۔ کیا جلدی ہے۔' شیرو نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔۔۔

'اب تو اِس درخت نے بھی توبہ کرلی ہے۔۔۔ اُٹھ جاؤ۔۔۔ دوپہر سر پہ ہے۔۔۔ سورج بھی پوچھ رہا تھا شیروا اُٹھ کیوں نہیں رہا۔۔' نائلہ نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

شیرو ہنسنے لگا۔۔۔ 'پتہ نہیں کہاں سے باتیں بناتی ہو تُم'۔

'یہ لو منہ ہاتھ دھو۔۔۔ میں اُتنے میں لسی لاتی ہوں۔۔۔' نائلہ نے کہا۔

'ٹھیک ہے جو حکم سرکار۔۔۔' شیرو نے مُسکراتے ہوئے کہا۔۔۔

'اُٹھ گیا میرا شیر۔۔۔' ماں ہاتھ میں لسی کا پیالہ پکڑتے ہوئے چار پائی تک

آئی ---

'دیکھ یہاں چھاؤں ہے اور ہوا بھی اچھی ہے --- میٹھی نیند سو یا ہو گا میرا لعل ---' اماں نے کہا۔

'جی اماں ---' شیرو نے جواب دیا۔

'بیٹا --- تو دِن چڑھے کیوں آیا ؟ گیا کہاں تھا ---' اماں نے بیٹھتے ہی سوال کیا۔

'وہ اماں --- شیرو کو رات والی ساری داستان یاد آنے لگی ---'

'کیا ہوا --- رُک کیوں گیا ---؟؟' ماں نے پوچھا۔

'نہیں وہ --- جلیل کی طرف تھے --- پھر کچھ دیر فیکے کی زمینوں پر بیٹھے رہے۔' شیرو نے جھوٹ بولا۔

'اچھا --- پُتر --- تیری واپسی کب ہے؟' اماں نے پوچھا۔

'بس اماں جانا تو اِسی ہفتے تھا پر اب اگلے ہفتے جاؤں گا' شیرو نے کہا۔ اور آگے کے پلان کے بارے میں سوچنے لگا۔

'بیٹا تو نے خالہ کی طرف بھی جانا تھا ---' اماں نے یاد دلایا۔

'ہاں اماں یاد ہے --- خالہ کی طرف جاؤں گا۔ بس دو دِن رہ کے پھر لاہور ---' شیرو نے جواب دیا۔

'دو دِن کیوں --- تیری چھٹیاں تو ایک ماہ کی رہتی ہیں ابھی ---' اماں نے پوچھا۔

'ہاں اماں --- مگر سوچ رہا ہوں لاہور جا کے ایک مہینہ کہیں کام پہ لگاؤں --- تجربہ بھی ہو گا اور دو چار روپے بھی کما لوں گا ---' شیرو نے جواب دیا۔

'پُتر تجھے پیسوں کی کمی ہے تو مجھے بتا ---' اماں نے پوچھا۔

'نہ ماں۔۔۔کمی نہیں ہے۔۔۔بس۔۔۔خود کام کرنا چاہیے۔۔۔شیرو نے جواب دیا۔

'پراٹھے کتنے بنانے ہیں بھائی۔؟ نائلہ نے پوچھا۔

'چار بنا۔۔۔چار۔۔۔دیسی گھی لگا کے۔۔۔' اماں نے تاکید کی۔

'او نہ گڑیا۔۔۔ٹھہر کے کھاؤں گا۔۔۔ابھی لسی پی ہے۔۔۔پھر بھوک بھی نہیں۔۔۔'

....

'او یار جلیل۔۔۔' شیرو نے کچھ کہنا چاہا۔

'میں بھی وہی سوچ رہا ہوں شیرو۔۔۔' جلیل نے کہا۔

'یہ بابا چراغ دین۔' شیرو نے کہا۔

'کیا ہوا۔۔۔؟؟ مجھے بھی بتاؤ کچھ۔۔۔' رفیق نے کہا۔

'یار بابا چراغ دین۔۔۔ہماری سوچ سے بھی پہنچا ہوا نکلا۔۔۔' بھولے نے کہا۔

'کیوں کیا ہوا۔۔۔'؟ رفیق نے پوچھا۔

'بابا ایک۔۔۔' بھولے نے کچھ کہنا چاہا۔

'بابا ایک بھوت ہے۔۔۔' جلیل نے جملہ پورا کر دیا۔

'کیا۔۔۔؟' رفیق اچانک اُٹھ کھڑا ہوا۔۔۔

'نہ کر یار۔۔۔ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟' رفیق نے کہا۔

'ہاں۔۔۔اُسے ایک بندے کی تلاش ہے جس کی وہ بلی چڑھائے۔۔۔ہم نے تیرا نام دے دیا ہے۔۔۔' جلیل ہنسنے لگا۔

'یار تُم لوگوں نے تو میرا۔۔۔' رفیق نے کچھ کہنا چاہا۔

'اچھا یار۔۔۔اب ذرا سنجیدہ بات کی طرف آؤ۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'معاملہ تو سنگین ہے۔ مجھے لگتا ہے، ہمیں اگلے مہینے چاند کی پہلی تاریخ کا انتظار کرنا چاہیئے۔۔۔' جلیل نے کہا۔

'نہیں یار۔۔۔ میں ایک ماہ اور نہیں رُک سکتا۔' شیرو نے کہا۔

'پھر کیا ہو سکتا ہے؟؟' جلیل نے پوچھا۔

'سوچتے ہیں کچھ۔۔۔' شیرو نے کہا۔

....

اگلی شام شیرو بغیر کسی کو بتائے بابا فقیر شاہ کی درگاہ کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ آسمان پر ہلکی ہلکی لالی اُبھری ہوئی تھی۔ کھیتوں کی ڈالیاں اور درخت سب سورج کو الوداع کہہ رہے تھے۔ شیرو کچھ دیر درگاہ کے قریب بیٹھا ارد گرد کا جائزہ لیتا رہا۔ مغرب کی آذان سُنتے ہی وہ درگاہ کے قریب لگے نلکے سے وضو کرنے لگا۔ نماز پڑھ کر کچھ دیر درگاہ پر بیٹھا رہا اور بابا چراغ دین کی حرکات پر غور کرتا رہا۔ بابا چراغ دین خاموشی سے کنویں کے کنارے بیٹھا رہا، پھر اللہ ہُو کی آواز لگائی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ کنویں کے کنارے پر رکھے برتن میں پانی بھرا اور پھر وضو کے بعد نماز ادا کرنے لگا۔ شیرو حیرت سے بابا چراغ دین کو دیکھنے لگا۔ سلام پھیرتے ہی بابا چراغ دین نے شیرو کو کہا، 'کیا بات ہے لڑکے؟؟'

'سلام بابا صاحب۔۔۔!' شیرو نے حواس پر قابو پاتے ہوئے سلام لیا۔

میں نے سُن رکھا تھا بابا چراغ دین بولتا نہیں ہے۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ شیرو نے خود کلامی کی۔

'کہو۔۔۔ کیسے آنا ہوا؟' ۔۔۔ بابا چراغ دین نے پُوچھا۔

'شاہ جی کو سلام کرنے آیا تھا۔۔۔' شیرو نے جواب دیا۔

'شاہ جی کی درگاہ پہ بیٹھ کے جھوٹ۔' بابا چراغ دین نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

شیرو کی حیرت میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ کچھ دیر بیٹھا رہا۔ اُس نے خاموشی میں ہی بھلائی جانی اور واپسی کا راستہ اختیار کیا۔

....

گوکھووال (فیصل آباد)

'یار شیرو۔' رفیق نے چارپائی پر لیٹے لیٹے کہا۔
'ہاں۔۔۔' شیرو نے جواب دیا۔
'سو گیا ہے؟؟'۔ رفیق نے پوچھا۔
'نہ۔۔۔' شیرو نے جواب دیا۔
'کیا سوچ رہا ہے پھر؟؟' رفیق نے پوچھا۔
'کل جا رہا ہوں۔۔۔' خالہ کے پاس۔
'پھر؟' رفیق نے کہا۔
'پھر یہ کہ۔۔۔بابا چراغ دین سے مِلنا چاہتا تھا ایک بار۔۔۔' شیرو نے کہا۔
'تو مِل لے۔۔۔' رفیق نے کہا۔
'کب ملوں یار' شیرو نے چارپائی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔
'ابھی چلتے ہیں۔۔۔' رفیق نے جواب دیا۔
'ابھی؟؟' ۔۔۔شیرو نے حیرانی سے کہا۔
'اگر بابا نہ ملا تو؟' شیرو نے پُوچھا۔
'یا قسمت یا نصیب۔۔۔۔!!' رفیق نے کہا۔
'صبح سے پہلے واپس آجائیں گے؟' شیرو نے پوچھا۔
'فکر ہی نہ کر۔۔۔بس تیاری پکڑ۔۔۔' رفیق نے کہا۔

'یہاں سے نہیں اُترنا۔۔۔پچھلی طرف سے۔۔۔'شیرو نے کہا۔

'وہاں تو سیڑھی بھی نہیں ہے بھائی۔۔۔'رفیق نے حیرانی سے کہا۔

'تو آ۔۔۔میں نیچے اتارتا ہوں۔۔۔'شیرو نے کہا اور آگے آگے چل دیا۔

'چھت کے دائیں جانب مُڑتے ہی، شیرو نے رفیق کو نیچے اترنے کا طریقہ بتایا اور فوراً ہی نیچے اُتر گیا، رفیق اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔'

'چھلانگ لگاتے ہی رفیق نے کہا، شیرو یار آج تو مروانے لگا تھا تُو۔۔۔اس سے بہتر تھا چاچی کے جوتے کھا لیتے۔۔۔پر سیدھے رستے سے اترتے۔۔۔'رفیق نے کہا۔

شیرو ہنسنے لگا۔۔۔'اسی کو تو adventure کہتے ہیں میرے بھائی۔'

'اچھا۔۔۔اب جلدی جلدی چل۔۔۔'شیرو نے کہا۔

چاروں طرف سبزہ لہلہا رہا تھا۔ سبزے کے درمیان سے رستہ بناتے ہوئے وہ بابا فقیر دین کی درگاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

'اچھا سُن۔۔۔'پہلے تھوڑی دیر بیٹھ کر دیکھ لینا کہ بابا ہیں یا نہیں اور میں سوچ رہا تھا کہ پیچھے یہاں کھیتوں میں بیٹھ جاؤں۔۔۔تو بابا کی درگاہ پہ جا، دونوں اکٹھے گئے تو مشکوک نہ لگیں۔ یہ نہ ہو تیرا کام بھی نہ ہو۔۔۔'رفیق نے کہا۔

'ہاں یہ بھی ٹھیک ہے یار۔۔۔پر کھیتوں میں پانی لگانے اس ٹائم لوگ اُٹھتے ہیں ناں۔۔۔اگر تجھے دیکھ لیا کسی نے؟؟'شیرو نے کہا۔

'نہیں دیکھتا کوئی۔۔۔۔میں سنبھال لوں گا'رفیق نے کہا۔

'نہیں تو ایسا کر۔۔۔اس کنویں کی اوٹ میں بیٹھ جا۔۔۔خاموشی سے۔۔۔درگاہ ہے۔ کوئی بھی بیٹھ سکتا ہے۔۔۔اور سلام کر کے بابا چراغ کو دیکھوں گا۔۔۔'شیرو نے کہا۔

'یہ بھی ٹھیک ہے۔۔۔'رفیق نے کہا۔

'تُو پہلے پہنچ۔۔۔'شیرو نے کہا۔

شیرو نے اپنی رفتار سست کر دی اور رفیق تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے درگاہ کی طرف چل رہا۔

درگاہ میں داخل ہونے سے پہلے شیرو نے اپنے جوتے اُتارے اور ساتھ موجود نلکے سے وضو کرنے لگا۔ وضو کر کے کنویں کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ اُسے بابا چراغ دین کہیں دکھائی نہ دیا۔ کنویں کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد شیرو درگاہ میں داخل ہوا، اُس نے جوتے رفیق کے جوتوں سے دُور رکھے اور وضو کرتے ہی درگاہ میں داخل ہو گیا۔ بابا فقیرہ شاہ کی قبر پر دعا مانگی اور باہر آ کر دیوار کے ساتھ بچھی دریوں پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں بابا چراغ دین کی متلاشی تھی مگر چراغ دین ابھی تک نظر نہ آیا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد شیرو اُٹھا اور درگاہ کے اردگرد گھوم کر درگاہ کا جائزہ لینے لگا۔ کنواں، وہاں موجود جلتے ہوئے دیے، بکھرا ہوا دانہ، لمبی شاخوں والا گاؤں کا سب سے پُرانا درخت جس کی شاخوں کے ساتھ سُرخ، پیلے اور کالے دھاگے بندھے تھے، شیرو یہ دیکھ کر مُسکرایا پھر دبے قدموں سے درگاہ کی پچھلی طرف جانے لگا۔ بائیں جانب مُڑتے ہی اس کی نظر ایک شخص پر پڑی جو درگاہ کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ چہرہ گھٹنوں میں چھپا ہوا تھا اور بازو گھٹنوں کے گرد پھیلائے بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے کوئی نہیں تھا مگر ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی کی تعظیم میں سر جھکائے اس کے سامنے بیٹھا ہے اور ابھی ایک حکم میں اپنی جان بھی نچھاور کر دے گا۔ شیرو کچھ دیر کھڑا خاموشی سے اس کو دیکھتا رہا پھر اس کی طرف بڑھنے لگا تو اچانک اس کا پیر لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ شیرو کے گرنے سے بابا چراغ دین نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا، اب بھاگنے کا کوئی چارہ نہ تھا۔ شیرو ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔

'آ گئے ہو آج پھر۔۔۔؟' بابا چراغ دین نے سوال کیا۔

'وہ۔۔۔' شیرو نے کچھ کہنا چاہا۔

'نہ۔۔۔نہ۔۔۔نہ جھاڑ کپڑے۔۔۔ایسے ہی رہنے دے۔۔۔مٹی لگی ہو گی نا

توکم ہوجائے گی۔اس مٹی میں ہی علاج ہے۔'شیرو نے ہاتھ فوراً روک دیئے۔

'بیٹھے گا کہ جائے گا؟'چراغ دین نے پُوچھا۔

بابا چراغ دین نے اس کی طرف دیکھا وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ بابا نے پوچھا۔۔۔'اکیلا آیا ہے کیا؟؟'

شیرو بس بابا چراغ دین کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔اسے لگا جیسے بابا بتا رہا کہ اکیلا نہیں آیا تُو۔۔۔'جی۔۔۔جی۔۔۔' بمشکل اس کے حلق سے آواز نکلی۔

'چاند چھپتا جا رہا ہے'۔۔۔بابا چراغ دین نے کہا۔

'آپ سوتو نہیں رہے تھے؟؟'شیرو نے ہمت کر کے پُوچھا۔

'نہیں۔۔۔حاضری دے رہا تھا۔'چراغ دین نے کہا۔

'حاضری۔۔۔؟؟'شیرو نے پُوچھا۔

'یہاں سب کیا کرنے آتے ہیں؟؟'چراغ دین نے پُوچھا۔

'حاضری دینے ہی ناں؟؟'چراغ دین نے کہا۔

'میں بھی یہی کر رہا تھا۔۔۔'بابا چراغ دین خود ہی سوال کرتا گیا اور ساتھ ساتھ خود ہی جواب دیتا گیا۔

'مگر حاضری تو درگاہ کے اندر دیتے ہیں۔ آپ باہر۔۔۔' شیرو نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

'وقت مناسب نہیں تھا۔ مُرشد کے آرام کا وقت تھا، میری کیا مجال کہ مُرشد کی خواب گاہ میں داخل ہونے کی گستاخی کروں۔۔۔ میں تو یہاں حضور کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ سر جُھکا کر، پلکیں بچھا کر۔۔۔۔ یہ دیکھ ناں۔۔۔ یہیں تو مُرشد کے پیر ہیں۔۔۔ ابھی تو پُوری درگاہ کا جائزہ لے کر آیا ہے پھر بھی نہیں پتہ چلا کہ پیر کہاں ہیں۔'چراغ دین نے کہا۔

''نہیں سرکار۔۔۔۔وہ۔۔۔'شیرو کو کوئی بات نہ سُوجھی۔

'مُرشد ہو یا محبوب۔۔۔۔ قدم جہاں پڑیں۔۔۔۔اپنے نشان چھوڑ جاتے ہیں۔۔۔صرف عاشق کونظر آتے ہیں وہ نشان۔۔۔تم کیا

جانو شاہ سرکار کو۔۔۔۔' چراغ دین نے کہا۔

'جی سرکار۔۔۔ہم کم علم، نہ سمجھ لوگ ہیں۔بس جب کام پڑتا ہے تو مُرشد کے دَر پر سر جُھکائے آجاتے ہیں۔' شیرو نے کہا۔

'کیا مُرشد سے کام تھا؟؟' چراغ دین نے پُوچھا۔

'جی۔۔۔۔جی۔۔۔سرکار' اُس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

'چاند غائب ہی ہوگیا' چراغ دین نے پُوچھا۔

شیرو نے سر اُٹھا کر دیکھا تو اندھیرا ویسا ہی تھا مگر چاند واقعی آسمان پر نہ تھا۔'جی سر کار۔۔۔چاند بھی رخصت ہوگیا۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'رُخصت نہیں ہوا پگلے۔۔۔شہر میں پڑھتے ہو اور یہ بھی معلوم نہیں کہ چاند رُخصت نہیں ہوتا۔۔۔نظروں سے اوجھل ہوا ہے ابھی، اور گُھومتا رہتا ہے، کبھی اِدھر، کبھی اُدھر۔۔۔مُرشد نے بتایا تھا' چراغ دین نے کہا۔

شیرو بابا کی بات سے مزید حیران ہوا۔۔۔

'کیوں بوکھلا گیا ہے؟؟ چراغ دین نے پُوچھا۔

'آج جانا ہے بابا۔اجازت لینے آیا تھا' شیرو نے کہا۔

'مُجھ سے۔۔۔؟' چراغ دین نے حیرانی نے پُوچھا۔

'اچھا ٹھیک ہے۔۔۔جا۔۔۔خیر سے جا۔۔۔اور خیر سے آ'۔ بابا چراغ دین نے کہا۔

'چل صبح ہونے کو ہے۔گھر پہنچ۔۔۔۔۔۔' بابا نے کہا۔

'اُس کو بھی جگا کے لے جانا، تیرا پہرہ دینے آیا تھا اور سو یا پڑا ہے۔' بابا چراغ

دین نے کہا۔

شیرو نے فوراً مُڑ کر دیکھا۔جا جا دیکھتا کیا ہے ؟؟' شیرو نے پھر مُڑ کر نہ دیکھا۔رفیق کواس نے اس کا انداز جگایا جس نے رفیق کوبھی بھاگنے پر مجبور کر دیا۔۔۔۔

'رفیق۔۔۔ رفیق۔۔۔اُٹھ یار۔۔۔ اُٹھ۔۔۔اُٹھ۔۔۔وہ ایک ہی سانس میں کہتا چلا گیا۔۔۔شیرو کی پریشان شکل اور انداز دیکھ کر رفیق نے دائیں دیکھا نہ بائیں دیکھا،اُس نے آخری بار درخت کے پاس کھڑے دیکھا تھا۔جو پہلی سوچ یہی ذہن میں آئی کہ یہ درخت کے پاس کھڑا ٹہنیوں کو چھیڑ رہا تھا اور مُسکرا بھی رہا تھا۔پھر ہے بھی اتنا حسین کہ۔۔۔اُف۔۔۔ یہی سب سوچا اور رفیق نے درگاہ کی سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگا دی۔۔۔سیڑھیوں میں پہنچ کر جوتے ہاتھ میں اُٹھائے اور آگے آگے بھاگنے لگا۔

شیرو درگاہ سے تیزی سے نکلا اور پھر بوجھل قدموں کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہوا۔گھر پہنچا تو دِن چڑھ چُکا تھا۔ہر طرف اُجالا ہی اُجالا تھا۔گاؤں کے لوگ اپنے اپنے کام کی تیاریوں میں تھی اور وہ اپنے ہوش اُڑائے اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔گھر پہنچتے ہی دروازہ کھٹکھٹایا۔۔۔

'کون۔۔۔ارے دیکھ نائلہ۔۔۔صُبح صبح کون ہے؟؟'' اماں نے کہا۔

نائلہ نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔

'بھائی۔۔۔آپ کہاں گئے تھے۔؟' اُس نے دروازہ کھولتے ہی سوال کیا۔

شیرو کوئی جواب دیئے بغیر آگے بڑھتا گیا اور چھت پر جا کر سو گیا۔۔۔

'اماں۔۔۔لگتا ہے صبح کی سیر کو گیا تھا اب اتنی نیند میں ہے کہ کوئی خبر نہیں۔۔۔' نائلہ نے کہا۔

'تم ایسا کرو چارپائی بچھا کے،اس کو لِٹا لو۔۔۔ ہاں اور پیروں کی طرف ایک اور چارپائی کھڑی کر دینا۔۔۔تاکہ دھوپ نہ آئے میرے شیرو پہ۔۔۔' اماں نے کہا۔

'واہ اماں۔۔۔۔واہ۔۔۔'نائلہ نے کہا۔

'ویسے آج تو بھائی نے خالہ کے ہاں جانا تھا نا۔۔۔نائلہ نے اماں کو یاد کرایا۔

'ہاں صبح۔۔۔ٹھنڈے ٹھنڈے نکل جاتا تو اچھا تھا۔اب دو پہر میں کیسے نکلے گا۔'ماں نے کہا۔

'میں جگاؤں کیا؟' نائلہ نے پوچھا۔

'نہیں نہیں۔۔۔سونے دے۔۔۔'اماں نے کہا۔

شیرو دو پہر میں اُٹھا تو اُٹھتے ہی جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔

'بیٹا اس وقت نکلے گا۔۔۔؟' تپتی لُو ہے باہر۔۔۔اماں نے کہا۔

'ہاں اماں ابھی جاؤں گا۔۔۔'شیرو نے جواب دیا۔

'گرمی دیکھی ہے۔۔۔؟' اماں نے سوال کیا۔

'ہاں اماں۔۔۔گرمی کیا ہوتی ہے۔۔۔موسم ہی ہیں سارے۔۔۔ٹھنڈ ہو تو ہمیں شکوہ۔۔۔سردی لگ رہی ہے۔۔۔گرم موسم ہو تو گرمی کی شکایت۔۔۔'شیرو نے کہا۔

'تیری مرضی۔۔۔'اماں نے کہا۔

'اب اجازت لے آیا ہوں۔۔۔رُک نہیں سکتا۔'شیرو نے کہا۔

'اجازت۔۔۔؟ کس سے؟؟' اماں نے حیرانی سے پُوچھا۔

'کچھ نہیں اماں۔۔۔بس چلتا ہوں۔۔۔'شیرو نے کہا۔

'اب کب آئے گا۔۔۔جلدی آؤں گا۔۔۔'شیرو نے کہا۔

'خالہ کو سلام دینا۔۔۔اور اڈے سے دو کلو لڈو لیتے جانا۔۔۔پہلی بار جا رہا ہے میرا شیر۔۔۔'اماں نے کہا

'جو حکم اماں۔۔۔'شیرو نے کہا اور نکل پڑا۔۔۔

....

سرگودھا (رسول آباد)

گوکھووال سے اُس نے رسول آباد کے سفر کی تیاری پکڑی۔۔۔پُورا راستہ وہ یہ سوچتا گیا کہ بابا چراغ دین آخر ہے کون؟؟

گرمی، بس کے ہارن کا شور، کچھ حضرات کھڑے تھے اور کچھ بیٹھے تھے۔۔۔ گرمی اور رش کے باعث گاڑی میں حبس بہت تھی۔ساتھ والا شخص، گرمی، موسم ہر چیز سے بے خبر سویا ہوا تھا اور انجانے میں اس کا سارا وزن شیرو پہ تھا۔مگر شیرو کو اس وقت کچھ نہیں سُوجھ رہا تھا۔اس کا دماغ اس پہلی رات میں ہی تھا جب انہوں نے بابا چراغ دین کا پیچھا کیا۔ وہ بہت حیران تھا کہ بابا ہر چاند کی پہلی رات کو وہاں کیوں جاتا ہے۔اسے وہم ہوا کہ کہیں بابا کالا جادو یا کسی غلط چکروں میں تو نہیں۔گاؤں میں اُسے فقیر کہا جاتا ہے، پہنچا ہوا بزرگ مانا جاتا ہے،اس کی عزت کی جاتی ہے، اگر بابا واقعی۔۔۔۔

نہیں۔۔۔بابا چراغ دین ایسا بندہ نہیں۔۔۔شیرو نے خود کلامی کی۔

'پھر اس رات وہ قبرستان کیوں گیا۔نہ صرف اس رات بلکہ چاند کی ہر پہلی رات کو وہ کیوں جاتا ہے۔۔۔شیرو نے صرف بابا کو ایک قبر کے قریب جاتے دیکھا اس کے بعد اس گاؤں کے لوگ کھیتوں میں پانی لگانے کی غرض سے باہر نکل آئے اور وہ مزید بابا چراغ دین کا پیچھا نہ کر سکے۔شیرو کو یہی بے چینی تھی کہ آخر بابا قبرستان کیا کرنے گیا۔اسی سوچ میں ڈوبے ہوئے کب اسے نیند نے اپنی آغوش میں لیا کچھ پتہ نہ چلا۔ جب آنکھ کُھلی تو ساتھ بیٹھا شخص اس کے کندھے پر سر ٹکائے آرام فرما رہا تھا۔آگے پیچھے دائیں بائیں کافی حد تک سیٹیں خالی ہو چکی تھی۔کنڈکٹر کی کانوں میں آواز پڑی اپنے سٹاپ کا نام سُن کر وہ جھٹ سے کھڑا ہوا۔اس کے کندھے کا سہارا لینے والا شخص ایک دم اُٹھ کے بیٹھ گیا۔نگاہ تیکھی کرتے ہوئے شیرو پر ڈالی، اس نے نظر انداز کیا اور سامان اُٹھا کر گاڑی سے اُتر گیا۔شام ہو چکی

تھی۔ موسم قدرے بہتر تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بارش ہونے کو ہے۔ اڈے سے ایک دوکان سے ماں کی تاکید کے مطابق مٹھائی لی اور تانگہ لے کر خالہ کے گھر کی جانب چل دیا۔ تانگے میں اس کے علاوہ اور بھی سواریاں موجود تھیں۔ جن میں ایک عورت جو کہ آگے بیٹھی تھی جب کہ ایک آدمی اور بچہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ شیرو بچے سے باتیں کرنے لگا۔ اس کے سکول کا نام پُوچھا، پھر رسول آباد کے موسم کا پوچھا۔

'لگتا ہے مینہ پڑنے والا ہے۔' بچے نے کہا۔

'اچھا۔۔۔ تمہیں کیسے پتا؟' شیرو نے بچے سے پُوچھا۔

'کل بھی ایسا ہی موسم تھا، باجی نے کہا بارش ہونے والی ہے۔ رانو نے کہا کہ نہیں ہوگی۔۔۔ پھر باجی اور رانو کی جلیبی جلیبی کی شرط لگی۔ باجی نے کہا اگر بارش ہوئی تو میں جلیبی کھلاؤں گی اور اگر نہ ہوئی تو رانو۔۔۔' یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔

'تو کیا بارش ہوئی؟؟' شیرو نے پوچھا۔

'نہیں۔۔۔' بچے نے بتایا۔

'تو پھر تو تمہاری باجی ہار گئی۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'مینہ نہیں پڑا مگر باجی کو جلیبی بھی نہیں کِھلانی پڑی۔۔۔' بچے نے کہا۔

'وہ کیسے۔۔۔؟' شیرو نے پُوچھا۔۔۔

'اتنی تیز آندھی آئی کہ سب اپنے اپنے ٹھیلے اُٹھا کے، دوکانیں بند کر کے۔۔۔ گھروں کو چلے گئے۔' بچے نے کہا۔

'تو پھر ہارا کون اور جیتا کون؟' شیرو نے کہا۔

'باجی نے کہا کہ بارش راستے میں ہے۔۔۔ کل تک تو آ ہی جائے گی۔۔۔' بچہ ہنسنے لگا۔

'رانو کی چھت پہ کوا بول رہا تھا۔ باجی اور رانو میں پھر شرط لگی صبح۔۔۔ کہ شام تک

کوئی مہمان آ رہا ہے۔۔۔' بچے نے کہا۔

'تو کیا مہمان آیا؟' شیرو نے پُوچھا۔

'نہیں۔۔۔۔وہ پھر ہنسنے لگا۔۔۔

'تو کیا با جی پھر شرط ہار گئی؟؟' شیرو نے پُوچھا۔

'نہیں۔۔۔'اب کی بار اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔۔۔

'اب با جی نے کیا کہا' ۔شیرو نے پُوچھا۔

'با جی نے کہا کہ بارش راستے میں ہے، مہمانوں کو بھی اُس نے روک رکھا ہے۔ دیکھنا۔۔۔شام کو جیسے ہی بادل گرجے گا ویسے ہی مہمان دروازے پہ دستک دے گا۔ وہ اندر آئے گا تو مینہ چھم چھم برسے گا۔۔۔مہمان مینہ کو اور مینہ مہمان کو لے کر آئے گا۔۔۔' بچے نے کہا۔

'شام تو ہو گئی تو کیا با جی کے گھر کوئی آیا؟؟' شیرو نے پُوچھا۔

'ابھی تک تو کوئی نہیں تھا۔ میں جا کر پتا کروں گا' بچے نے کہا۔

'اگر مہمان نہ آیا تو پھر کیا تمہاری با جی جلیبی کھلائے گی؟؟' شیرو نے پوچھا۔

بچہ ہنسنے لگا۔۔۔'نہیں پھر کہے گی کہ شام ہوئی ہے، رات ابھی باقی ہے، رات ہو گی تو کہے گی۔۔۔سو جاؤ سب۔۔۔بہت رات ہو گئی ہے۔'

'با جی لگتی کیا ہے تمہاری؟؟' شیرو نے پُوچھا۔

'باؤ جی۔۔۔جانا کدھر کو ہے؟؟' تانگے والے نے پُوچھا۔

'وہ جدھر بوہڑ کا درخت ہے نا۔۔۔اس کے سامنے والی گلی میں۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'باؤ جی اندر تو تانگہ نہیں جائے گا۔۔۔' تانگے والے نے کہا۔

'مجھے محمد سلامت کی طرف جانا ہے وہ جس کی شہر میں دو کانیں ہیں' شیرو نے

کہا۔

'میں خود چھوڑ آؤں گا باؤ جی۔۔۔آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آپ سلامت صاحب کے مہمان ہو' تانگے والے نے کہا۔

'کوئی بات نہیں بھائی۔تم گھر بتا دینا۔۔۔میں چلا جاؤں گا' شیرو نے کہا۔

'بابو۔۔۔تم کیا لگتے ہو۔۔۔سلامت ماما کے۔۔۔؟؟'' بچے نے پُوچھا۔

'میں۔۔۔'وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔۔۔

'سلامت ماما میرے خالو ہیں۔'شیرو نے کہا۔

'تمہارا نام کیا ہے بابو۔۔۔؟' بچے نے پُوچھا۔

'مشراز۔۔۔'شیرو نے جواب دیا۔۔۔

'کیا نام ہے؟؟' بچے نے پھر سے پُوچھا۔

'مشراز۔۔۔'شیرو نے مُسکرا کر، آہستہ سے جواب دیا۔

'اب تُم بتاؤ۔۔۔تُم کیا لگتے ہو سلامت خالو کے؟؟' شیرو نے پُوچھا۔

'میں تو ان کے گھر کے ساتھ رہتا ہوں۔۔۔امی کے منہ بھولے بھائی ہیں۔۔۔' بچے نے کہا۔

'یعنی۔۔۔ہم تو رشتہ دار ہوئے۔'شیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

بچہ ہنسنے لگا۔۔۔

'اور رانو تو تمہاری خالہ زاد بہن ہوئی نہ۔۔۔؟؟' بچے نے کہا۔

'پتہ نہیں۔۔۔جب میں آخری بار ملا تھا ناں خالہ سے تو شاید رانو کوئی تین یا چار سال کی ہوگی۔۔۔'شیرو نے جواب دیا۔

'اچھا۔۔۔چلو کوئی نہیں اب وہ پورے چودہ سال کی ہو شاید۔۔۔' بچے نے کہا۔

'تمہاری باجی بھی رانو کی بہن ہے کیا؟؟' شیرو نے پُوچھا۔

'ہاں۔۔۔نہیں۔۔۔پتہ نہیں۔۔۔' بچے نے کہا۔

'چلو اب اُترو باؤ جی۔۔۔' بچے نے ہنستے ہوئے کہا۔

تانگہ گلی کے موڑ پر رُکا۔۔۔ساتھ ہی بجلی زور سے لڑکی۔۔۔

'اوہ۔۔۔ہائے اللہ خیر۔۔۔' بچے نے ڈر کے کہا۔

'دیکھو۔۔۔لگتا ہے اب تو بارش آئی ہی آئی۔۔۔' شیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

'بارش آئے نہ آئے۔۔۔ مجھے تو جلیبی دونوں طرف سے ملے گی۔۔۔' بچہ ہنسنے

لگا۔

شیرو سامان اور مٹھائی کی ٹوکری اُٹھائے اپنی منزل کی طرف گامزن تھا۔

'لاؤ باؤ شیراز۔۔۔ڈبہ میں اُٹھالوں۔۔۔' بچے نے کہا۔

'شیرو ہنسنے لگا۔۔۔شیراز نہیں۔۔۔۔مشراز۔۔۔۔میم سے مشراز۔۔۔' شیرو

نے کہا۔

'جو بھی ہے۔۔۔میری زبان پہ نہیں چڑھتا اتنا مشکل نام۔۔۔' بچے نے منہ بنا

تے ہوئے کہا۔

'ویسے تمہارا نام کیا ہے۔۔۔؟' شیرو نے اُسے مٹھائی پکڑاتے ہوئے کہا۔۔۔

'مجھے سب حیدری کہتے ہیں۔۔۔حیدر ہے میرا نام۔۔۔' بچے نے بتایا۔

'یہ تو بہت ہی خوبصورت نام ہے۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'بس باؤ جی۔۔۔یہی رُک جاؤ۔۔۔' بچے نے کہا۔

ایک دم بادل زور سے گرجا اور ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔۔۔

'دیکھا۔۔۔کہا تھاناں۔۔۔بارش آئے گی۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'گھر بھی آ گیا ابا ؤ جی۔۔۔' حیدر نے کہا۔

'چلو بچو چلو۔۔۔جلدی سے۔۔۔آرام آرام سے چلنا۔۔۔ابھی زیادہ کیچڑ نہیں

ہوا ہوگا اور سیدھا گھر جانا۔۔۔'

ایک نسوانی آواز نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ وہ دروازے سے ذرا ہٹ کر بچوں کے نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔

'یہ دیکھا۔۔۔باجی کی آواز۔۔۔' حیدر نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

'تو کیا ہم یہیں کھڑے باجی کی آواز سُنتے رہیں گے؟؟' شیرو نے کہا۔

حیدر ہنسنے لگا۔۔۔'نہیں نہیں آؤ ناں باؤ جی۔۔۔راستہ چھوڑو جی۔۔۔مہمان آ گئے۔۔۔ یہ کہتا ہوا آگے آگے چلنے لگا۔۔۔شیرو اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

حیدر نے باجی کی طرف دیکھا اور کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔۔۔'باجی مہمان آ گئے۔۔۔مہمان۔۔۔رانو کہاں ہے؟ رانو۔۔۔' حیدر رانو کو آوازیں دینے لگا۔

'پاگل۔۔۔ان کو اندر لے کر جاؤ۔۔۔رانو سے کیا کام۔' باجی ہنسنے لگی۔

'سلام۔۔۔کیا حال ہے؟' باجی نے کہا۔

'میں ٹھیک ہوں۔۔۔اللہ کا کرم ہے باجی آپ سُنائیں۔۔۔؟' شیرو نے کہا۔

برآمدے میں کھڑے وہ ایک دوسرے کا حال چال دریافت کرتے رہے۔ آپ یہاں ہوتی ہیں۔۔۔

'مجھے یاد ہے آپ تو سکینہ ماسی کی بیٹی ہیں ناں؟؟؟' شیرو نے کہا۔

'ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔' باجی نے کہا۔

اتنے میں حیدر رانو کو لے آیا۔۔ 'باجی۔۔۔ آ گئی رانو اور ہنسنے لگا۔۔۔رانو۔۔۔بارش۔۔۔مہمان۔۔۔جلیبی۔۔۔'

'کون آیا ہے؟' امی کی آواز آئی۔۔۔

'شیرو آیا ہے سلمٰی خالہ۔۔۔رانی ماسی کا بیٹا۔۔۔' باجی نے جواب دیا۔

'میں آ گئی۔۔۔' سلمٰی نے آواز دی۔۔۔

اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی باہر برآمدے میں آ گئی۔

شیرو خالہ کو دیکھ کر اُٹھا۔۔۔

آپ کو کیا ہوا خالہ۔۔۔؟ خالہ کی پیر پہ پٹی بندھی دیکھ کر شیرو ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔۔۔

'بس بیٹا۔۔۔موچ آ گئی تھی۔۔۔تُم بتاؤ کیسے ہو؟؟ آخر دِل نکال ہی لیا غریب خالہ سے ملنے کیلئے۔۔۔' سلمٰی اُس کے سر پر پیار دیتے ہوئے بولی۔

'بس خالہ وقت ہی کہاں ملتا ہے۔۔۔ابھی بھی یہی سوچ کر آیا تھا کہ آدھی چھٹیاں آپ کے پاس گزاروں گا۔۔۔مگر پھر وقت ہی کم رہ گیا ہے اب۔۔۔مگر بے فکر رہیں دو تین دِن ادھر ہی ہوں اب۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'یہ بہت خوشی کی بات ہے۔' خالہ شیرو کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

'کوئی پانی وانی پلا میرے شیر کو؟؟' خالہ نے پُوچھا۔

'جی خالہ۔بس لاتی ہوں۔' مہرین نے کہا۔

'تُو ملی ہے شیرو سے؟' خالہ نے رانو کو کہا۔

'سلام بھائی شیرو۔۔۔' رانو نے کہا۔

شیرو اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے بولا۔۔۔وعلیکم السلام گُڑیا۔۔۔

'یہ تیری فیصل آباد والی خالہ کا بیٹا ہے۔۔۔شہر میں ہوتا ہے۔۔۔بیٹا تیرے حُسن کے چرچے تو پُورے رسول آباد میں ہے۔۔۔اب دیکھنا جیسے جیسے پتہ چلے گا سب کو۔۔۔صبح ملنے آ جائیں گی۔۔۔بس بیٹا۔۔۔دُور سے مِلنا۔۔۔کسی سے کچھ لے کر نہ کھانا۔۔۔یہاں کی عورتوں کا کچھ پتہ تو نہیں چلتا۔۔۔جہاں خوبصورت پڑھا لکھا گبھرو جوان دیکھا۔۔۔اپنی بیٹی کو مِلوانے لے آتی ہیں۔۔۔' خالہ نے کہا۔

شیرو سر کُھجاتے ہوئے نیچے دیکھنے لگا اور کن اکھیوں سے رانو کی طرف دیکھ کر

مُسکرانے لگا۔

رانو بھی ہنسنے لگی اور کہنے لگی۔۔۔'اماں جی اماں جی دیکھو ذرا۔۔۔شیرو بھائی کیسے شرما رہے ہیں۔۔۔'

'شیرو بھائی کہاں سے۔۔۔تیرے جتنا ہی ہے۔۔۔ویسے میرا بیٹا کھاتے پیتے گھرانے سے ہے ناں تو جوان لگتا ہے۔تجھ سے چند ایک ماہ بڑا ہوگا' خالہ نے ڈوپٹے کا پَلو دانتوں تلے دباتے ہوئے کہا۔

'جی۔۔۔ویسے خالہ۔۔۔رانو مجھ سے کوئی سات آٹھ سال چھوٹی ہوگی۔۔۔'

شیرو ہنسنے لگا۔

'اے۔۔۔ایسی بھی کوئی بات نہیں۔۔۔' خالہ ہنسنے لگی۔

'اچھا یہ مہرین باجی کی والدہ کا سُنا تھا۔۔۔تب میں ابھی نیا نیا شہر گیا تھا۔۔۔آ بھی نہیں سکتا تھا۔۔۔اب آپ کے پاس ہوتی ہیں؟؟' شیرو نے پُوچھا۔

'ہاں۔۔۔بہت اچھی ہے میری مہرو۔۔۔پہلے باپ چلا گیا۔پھر اب ماں بھی رُخصت ہوگئی سو میں لے آئی۔۔۔اور تھا کون اِس کا۔۔۔تیرے خالو سے بھی بچپن سے ہی بیٹیوں جیسا پیار تھا۔۔۔ویسے وہ تو اپنی چھوٹی بہن مانتا تھا اُس کو مگر میری وجہ سے رشتہ بدل گیا۔۔۔تیرے خالو سے چند سال ہی چھوٹی ہے۔' خالہ نے کہا۔

'یعنی خالہ۔۔۔آپ خالو سے بڑی ہیں۔۔۔؟' شیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

'بہت مذاق کرتا ہے تُو۔۔۔' خالہ نے کہا۔

اتنے میں مہرین دودھ کا جگ اور گلاس لے کر برآمدے میں آئی۔مہرین شکل و صورت کی ایک عام سی لڑکی تھی۔بی اے پاس تھی۔۔۔بی اے کر کے وہ خالہ کے گھر آئی تھی، اب یہاں سکول میں اور گھر میں ٹیوشن پڑھاتی تھی۔

'کیا لے آئیں۔۔۔مہرین باجی آپ۔۔۔؟' شیرو نے پوچھا۔

'سردائی ہے۔۔۔خالص دودھ اور باداموں والی۔' مہرین نے کہا۔

'اماں نے بھی ناں۔ایک ماہ خالص چیزیں کھلا کھلا کے یہ حال کر دیا ہے۔۔۔ اب یہاں بھی۔' شیرو نے کہا۔

'دیکھا۔۔۔ میں کہتی تھی ناں۔۔۔ کہ شیرو رانو سے زیادہ بڑا نہیں۔۔۔ یہ تو۔۔۔' خالہ کو مہرین نے ٹوکا۔۔۔

'خالہ ابھی تو آپ کا بھتیجا آیا ہے تھکا ہوا۔۔۔آپ ابھی سے اس کے گُن گانے لگیں۔۔۔' مہرین نے شیرو کو گلاس تھماتے ہوئے کہا۔

'وہ تھکا ہوا ہے تو کیا۔۔۔ گُن تو میں گا رہی ہوں ناں۔۔۔' خالہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

شیرو ہنسنے لگا۔۔۔'کوئی بات نہیں مہرو باجی۔۔۔خیر ہے۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'حیدر۔۔۔تُم لو گے؟؟' مہرو نے حیدر سے پُوچھا۔

'نہیں باجی۔۔۔ میں تو گرم جلیبی کے انتظار میں ہوں۔۔۔اس کے ساتھ سادہ دودھ لوں گا۔۔۔' حیدر نے کہا اور سب اس کی بات پر ہنسنے لگے۔

'چلو رانو جی۔۔۔گرم گرم جلیبی منگواؤ۔۔۔' باجی نے کہا۔

'ہاں جی گڑیا بیٹا۔۔۔اب تو آپ کو جلیبی منگوانی پڑے گی۔ میں حیدر اور باجی ایک طرف ہیں' ۔شیرو نے کہا۔

'اُس کا نام رانو ہے۔۔۔رانو کہہ اُسے۔۔۔' خالہ نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

شیرو مہرو کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔۔۔مہرو نے بھی کندھے اُچکا کر جواب دے دیا اور مُسکرانے لگی۔

....

مہرو دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔شیرو بیڈ پر لیٹا آرام کر رہا تھا۔

'شیرو کھانا لاؤں۔۔۔؟' مہرو نے پُوچھا۔

'آپ لوگ نہیں کھائیں گے؟؟' شیرو نے پُوچھا۔

'نہیں سب نے دودھ جلیبی کھالی تھی اور سو گئے ہیں۔۔۔ خالو آج شہر ہی رہیں گے اور رانو اندر میرے ساتھ کمرے میں تھی۔ خالہ بھی سو چکی ہیں۔' مہرو نے کہا۔

'چلیں آپ اور مہرو ہی میرا ساتھ دے دیں۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'ہاں ضرور۔۔۔ میں رانو کو بلاتی ہوں۔' مہرو نے کہا۔

کچھ ہی دیر میں رانو کمرے میں داخل ہوئی۔ رانو اپنے لڑکپن میں تھی۔ وہی لڑکیوں کی طرح تیار ہونا، پائل، مہندی کا شوق رکھنا، ہنسنا کھیلنا، سب اُس میں پایا جاتا تھا۔ تھی بھی حسین تو تمام شوخ اور چنچل اداؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھی۔

'میں آجاؤں۔۔۔؟؟' رانو نے دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

'ہاں بیٹا آؤ آؤ ضرور۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'آپ کے گھر مہمان آئیں ہیں اور آپ کو معلوم ہی نہیں۔' شیرو نے مصنوعی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

'معلوم کیوں نہیں؟؟ میرے سامنے ہی تو آئے تھے آپ۔' رانو نے کہا۔

'اچھا۔۔۔ تو آپ پھر ملنے ہی نہیں آئیں۔۔۔ نہ کھانے کا پُوچھا نہ پانی کا۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'مہرو باجی ہیں ناں۔۔۔ وہی پُوچھتی ہیں سب سے۔۔۔' رانو نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

'اچھا۔۔۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'تو کیا تُم پڑھتی ہو؟؟؟' شیرو نے پُوچھا۔

'ہاں جی۔۔۔ میں آٹھویں کلاس میں پڑھتی ہوں۔' رانو نے کہا۔

'نہیں گاؤں کے سکول میں۔؟' شیرو نے پُوچھا۔

'ہاں۔۔۔۔وہ جو اڈے کے پاس ہیں ناں۔۔۔۔جہاں سے آپ تانگے میں بیٹھے تھے۔وہیں پہ۔۔۔' رانو نے کہا۔

'لو جی مہرو باجی بھی آ گئیں۔۔۔' شیرو نے اُٹھ کر ان کے ہاتھ سے ٹرے لیتے ہوئے کہا۔۔۔'یہ مجھے دیجئے میں خود ٹیبل پہ لگا لیتا ہوں۔' شیرو نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

'جاؤں رانو تُم پانی کا جگ لے آؤ۔۔۔' شیرو نے رانو کو کہا۔

'اس کو کیا پتہ چلے گا۔۔۔میں خود لے کر آتی ہوں۔۔۔' مہرو نے کہا۔

'میں لے کر آتی ہوں باجی۔۔۔' یہ کہتے ہوئے رانو فوراً پانی کا جگ لینے چلی گئی۔

'آپ کو شاید میں یاد نہیں ہوں۔۔۔ہم خوشی ماموں کی شادی پر ملے تھے آخری بار۔آپ نے ہمارے ساتھ کرکٹ کھیلی تھی اور بہت مزہ آیا تھا تب۔وہ لطیف چاچا کا بیٹا بھی تھا جس کی دو سال پہلے شادی ہوئی ہے۔' شیرو نے کہا۔

'ہاں جی مُجھے بالکل یاد ہے'۔مہرو نے کہا۔

'باجی تو ابھی بھی ہمارے ساتھ کرکٹ کھیلتی ہیں۔۔۔' رانو جگ ہاتھ میں اُٹھائے اندر داخل ہوئی۔

'بس باجی تو پھر آل راؤنڈر رہیں ناں۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'آؤ گڑیا تم بھی بیٹھو' شیرو نے کہا۔

'تمہیں ڈال کر دوں رانو۔۔۔؟' مہرو نے رانو سے پُوچھا۔

'نہیں باجی۔۔۔دودھ جلیبی کھائی تو بھوک ہی نہیں رہی۔' رانو نے جواب دیا۔

'لگتا ہے کھانا بہت مزے کا ہے۔' شیرو نے اپنی پلیٹ میں چاول ڈالتے ہوئے کہا۔

'مہرو باجی نے بنایا ہے۔' رانو نے کہا۔

'یہ بھی لیں آپ۔۔۔' رانو نے رائتہ آگے کرتے ہوئے کہا۔

شیرو کو اس کا انداز بہت عجیب لگا۔ اُسے لگا کہ رانو کو خالہ کی باتوں کا اثر کچھ جلدی ہو گیا ہے۔

'جی بیٹا۔۔۔ میں لے رہا ہوں۔۔۔' شیرو نے جواب دیا۔

'آپ کو بھی ناں، خالد چاچا کے بیٹے بشیر کی طرح بات بے بات بیٹا کہنے کی بیماری ہے۔' رانو نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

'اصل میں رانو کو بہت عجیب لگتا ہے جب کوئی اُسے بیٹا بچہ کہتا ہے۔۔۔' مہرو نے بات گھماتے ہوئے کہا۔

'بھئی اب مجھ سے چھوٹی ہے تو گڑیا یا بیٹا ہی کہوں گا نا۔۔۔ آپ بھی لیں نا مہرو باجی۔۔۔' شیرو نے ٹرے مہرو کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

مہرو نے اس سے ٹرے پکڑتے ہوئے کہا 'ہاں میں لیتی ہوں۔۔ پر تم بے تکلف ہو کر کھانا۔۔۔ اپنا ہی گھر سمجھنا۔۔۔'

'آپ ہیں نا۔ اب تو اپنا اپنا سا گھر ہی لگتا ہے اور ویسے بھی ہماری دوستی بہت پُرانی ہے۔ رانو کو کیا پتہ۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'جی سب پتہ ہے جناب۔۔۔ پہلے جب کبھی شادی پہ بھی آپ کے سارے رشتہ دار آئیں گے، سرگودھا والے بھی، برکی والے بھی، قلعہ والے بھی سارے۔۔۔' رانو نے کہا۔

'اچھا تو جناب۔ مہرو باجی کی شادی کی تیاریاں چل رہی ہیں۔۔۔' شیرو نے پانی گلاس میں ڈالتے ہوئے کہا۔

باہر بارش اپنے زوروں پر تھی۔ ایک دم بادل زوردار آواز میں گرجا۔

’رانو۔۔۔رانو۔۔۔مہرو۔۔۔‘ خالہ نے دونوں کو آواز دی۔

’جی خالہ۔۔۔‘ مہرو فوراً خالہ کی آواز سے اُٹھی۔۔۔

’آج تو لگتا ہے ساری رات بارش ہوگی۔۔۔‘ شیرو نے کہا۔

’بیٹا کہاں ہو دونوں۔۔۔؟‘ خالہ نے مہرو سے پوچھا۔

’شیرو کو کھانا دیا ہے خالہ۔۔۔‘ مہرو نے جواب دیا۔

’رانو کو کہنا تھا ناں۔۔۔ساتھ کھانا دے تمہارے۔‘ خالہ نے کہا۔

’جی خالہ رانو بھی ساتھ تھی۔‘ مہرو نے کہا۔

’اب وہ اکیلا بیٹھا کھا رہا ہے۔؟ رانو کو کہنا تھا ناں کہ ساتھ دے مہمان کا۔ دُور شہر سے آیا ہے، اچھا نہیں لگتا۔‘ خالہ نے کہا۔

’جی خالہ۔۔۔اُسے بھوک نہیں تھی مگر ادھر ہی بیٹھی ہے۔ میں بھی ساتھ تھی، ابھی آئی ہوں۔‘ مہرو نے کہا۔

’ٹھیک ہے۔۔۔‘ سلمیٰ مُسکرانے لگی۔

....

’آج لگتا ہے بارش نہیں ہوگی۔۔۔‘ شیرو جو کہ چھت پر تھا، وہیں سے کھڑے کھڑے نیچے آواز دے کر کہنے لگا۔

’ہاں جی۔۔۔میرا خیال ہے بارش آج تو ہوگی ہی۔‘ رانو چار پائی پر اپنے بال لٹکا کر لیٹی ہوئی تھی۔ آسمان کی طرف دیکھتے دیکھتے اُس نے کہا۔

’تمھیں کیوں لگتا ہے کہ بارش ہوگی؟؟‘ شیرو نے چھت کے کنارے بیٹھتے ہوئے کہا۔

’کیونکہ۔۔۔بس نہیں ہوگی۔۔۔‘ رانو نے شیرو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’شیرو دھیان سے بیٹھنا۔۔۔دیواریں بھی نہیں ہیں اور بارش کی وجہ سے کیچڑ

ہوئی ہے۔'مہرو نے ایک روٹی توے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''جی مہر وبا جی۔۔۔ بہتر۔۔۔ ویسے آپ کو کیا لگتا ہے کہ بارش ہوگی یا نہیں۔۔۔؟؟' شیرو نے پُوچھا۔

'نہیں۔۔۔'مہرو نے روٹی سینکتے ہوئے کہا۔

'اور وجہ۔۔۔'؟شیرو نے پُوچھا۔

'کیونکہ میں نے کپڑے چھت پر پھیلائے ہیں۔۔۔اور بارش ہوگئی تو آج بھی نہیں سوکھیں گے۔'مہرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

'آپ بھی نا مہرو جی۔۔۔'رانو نے بال سمیٹتے ہوئے کہا۔

'ویسے مس رانو۔۔۔آپ اپنے بال ذرا سمیٹ کر رکھا کریں۔۔۔آپ کی زلفوں کو نظر بھی لگ سکتی ہے۔'شیرو نے کہا۔

'کس کی نظر لگے گی مجھے؟؟'رانو نے کہا۔

رانو نے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔

'کسی کی نہیں۔۔۔میری بیٹی۔۔۔میں روز اس کی نظر اتارتی ہوں۔۔۔' خالہ نے کُرسی سے اُٹھ کر شیرو کو دیکھنے کی کوشش کی جو کہ خالہ ہی کی سمت میں کھڑا تھا جس کی وجہ سے خالہ کا دیکھنا مشکل تھا۔

'خالہ۔۔۔بیٹھی رہیے۔وہ نظر نہیں آئے گا۔۔۔'مہرو اور شیرو ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔

'کمال ہے خالہ۔۔۔یہ بھی کوئی نظر اُتارنے والی چیز ہے؟؟' شیرو نے اُسے تنگ کرتے ہوئے کہا۔

'جی جی آپ کو آئے ہوئے صرف دو دِن ہوئے ہیں اور آپ ہمارے مہمان ہیں ورنہ۔۔۔آپ مجھے جانتے نہیں ہیں ابھی۔۔۔'رانو نے شیرو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

'اچھا جناب۔۔۔' شیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

'آجاؤ شیرو اب نیچے۔۔۔ گرم گرم روٹی کھا لو۔۔۔ میں کھانا لگاتی ہوں' مہرو نے روٹیاں سمیٹتے ہوئے کہا۔

'نہیں۔ پہلے آپ سب کاموں سے فارغ ہو جائیں، پھر ہم اکٹھے کھائیں گے۔' شیرو نے کہا۔

'مجھے بھوک نہیں ہے۔' مہرو نے چولہا بجھاتے ہوئے کہا۔

'کیسے بھوک نہیں ہے، خالہ ان کو کہیں ناں۔۔۔ کیوں رانو؟' شیرو نے سیڑھیاں اُترتے ہوئے کہا۔

'ہاں ہاں ساتھ ہی کھائے گی، مہرو بیٹا۔۔۔ جلدی ختم کر لو کام، اب میرا شیر روز روز کہاں آتا ہے؟؟' خالہ نے کہا۔

'ہاں بالکل۔۔۔' شیرو ہاتھ دھونے کی غرض سے نلکے کی طرف بڑھا۔۔۔

'رانو اُٹھ۔۔۔ وہ جا۔۔۔ شیرو کے ہاتھ دُھلوا۔۔۔ بلکہ شیرو تو آ کر ادھر بیٹھ جا۔۔۔ رانو ادھر لے آئی گی پانی۔۔۔' خالہ نے شیرو سے کہا۔

'لے ہی نہ آئے وہ پانی خالہ۔۔۔ میں خود کر لوں گا سب، ویسے بھی مجھے خود کام کرنے کی عادت ہے، گڑیا زحمت نہ ہی کرے۔' شیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

'رانو جوان بچی ہے میری، سب کام جانتی ہے۔ اُسے گڑیا نہ کہا کر۔۔۔' خالہ نے کرسی کا سہارا لے کر اُٹھتے ہوئے کہا۔

'جی بہتر خالہ۔۔۔' شیرو نے جواب دیا۔

'آیئے اب، آئیں خالہ آپ بھی۔۔۔' شیرو نے زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

'مجھے تو اوپر کرسی پر ہی دے دو۔۔۔' خالہ نے کہا۔

'جی خالہ۔۔۔ میں ڈال دیتی ہوں' مہرو نے پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

'ویسے میں سوچتی ہوں کبھی کبھار کہ مہرو باجی ۔۔۔آپ کی شادی کے بعد ہمارا کیا بنے گا؟؟' رانو نے کہا۔

'اتنے مزیدار کھانے، آپ کے ساتھ کھیلنا اور مجھے پڑھائے گا کون؟' رانو نے کہا۔

'تُم کیوں ایک دم اُداس ہوگئی گڑیا، ابھی تو نہیں ہو رہی مہرو باجی کی شادی۔' شیرو نے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

'ایسا کرتے ہیں مہرو باجی کی شادی ہی نہیں کرتے۔' رانو نے کہا۔

خالہ کوئی چیز اُٹھانے کی غرض سے ادھر اُدھر ہاتھ پھیرنے لگیں، 'ٹھہر ادھر ہی ۔۔۔ کتنی بار کہا ہے کم بخت کو کہ اچھی بات منہ سے نکالا کر۔ جی تو کر رہا ہے کہ یہ گلاس ہی اُٹھا کے ماردوں۔۔۔۔'

رانو ہنسنے لگی اور آہستہ سے شیرو کو کہنے لگی دیکھا مجھ سے زیادہ پیار امی مہرو باجی سے کرتی ہیں۔

'بڑی خدمت گزار بچی ہے میری۔ اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔ تیری طرح پھوہڑ نہیں ہے، نہ نکمی ہے۔ بی اے پاس ہے، گھر کے سب کام، سلائی کڑھائی سب جانتی ہے۔' خالہ کہنے لگی۔ سلمٰی خالہ ایسی ہی تھی، دِل کی صاف اور زبان کی سچی۔ جو منہ میں آئے بول دیتی تھی۔ مہرین ان کی سگی اولاد نہیں تھی مگر دو سالوں میں ہی مہرین کی خدمت گزاری اور سمجھداری نے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ رانو کی بات بے بات تعریف تو کرتی تھیں مگر سُننے والا فوراً سمجھ جاتا کہ خالہ سے جھوٹ نہیں بولا جاتا۔

'آج کے دور میں کون کرتا ہے بی اے۔' خالہ نے مزید کہا۔

'یہ دیکھیں نہ ان کو۔۔۔ انہوں نے کیا ہے نہ بی اے اور اب ایم اے کر رہے ہیں۔' رانو نے کہا۔

’بحث پہ بحث کئے جا رہی ہے، میں لڑکیوں کی بات کر رہی ہوں ‘ خالہ نے جواب دیا۔

مہرین اس پُوری گفتگو کے دوران مُسکراتی رہی۔ اس کو بولنے کی ضرورت کیا تھی۔خالہ اس کے خلاف بات کرتی تو رانو اس کی محافظ بنتی ،رانو کرتی تو خالہ فوراً سینہ تان کر کھڑی ہوجاتیں۔

’خالو آج بھی نہیں آئیں گے؟؟‘مہرو نے پُوچھا۔

’نہیں بیٹا، تین دِن اور لگیں گے۔ مال لے کر ملتان جانا ہے۔‘خالہ نے جواب دیا۔

’میں سوچ رہا تھا خالو سے مِل کر جاتا۔‘شیرو نے کہا۔

’تم تو بیٹا دو ہفتوں سے پہلے جانے کا بھی نہ سوچنا۔اور کل صبح جا کر اڈے کے ساتھ دوکان ہے وہاں سے خالو کو فون کر لینا۔۔ بتا دینا کہ تُم آئے ہوئے ہو۔‘خالہ نے کہا۔

’جی خالہ میں صبح ہی فون کر دیتا ہوں۔مگر جاؤں گا پرسوں صبح۔۔۔ بہت دِن ہو گئے ہیں۔‘شیرو نے کہا۔

شیرو نے پلیٹ سائیڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔

مہرو برتن اُٹھانے لگی۔

’چل رانو۔۔۔اُٹھ۔۔۔برتن اُٹھا۔۔‘خالہ نے کہا

’اچھا امی۔۔۔‘رانو منہ بناتے ہوئے اُٹھی۔

’بس بیٹا۔۔۔ اللہ سب خیر خیریت رکھے تو اب ہم مہرین کے لئے رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں، جو آتا ہے کوئی مڈل پاس تو کوئی پرائمری۔۔۔‘خالہ نے شیرو سے کہا۔

اتنے میں رانو برتن لینے آئی ،ٹرے اُٹھاتے ہوئے بولی۔

’اماں۔۔۔ایک مشورہ دُوں؟‘

'بول۔۔۔اگر کوئی عقل کی بات ہے تو۔۔۔' سلمیٰ خالہ نے کہا۔

'مہرو باجی بھی بی اے پاس ہے اور یہ بھی۔۔۔' اور کھسیانہ ہنسی ہنسنے لگی۔

'شرم کر، حیا کر۔۔۔اب نہیں تو بچے گی۔۔۔' خالہ کُرسی سے اُٹھنے لگی۔

'اماں تیرے پیر میں موچ ہے۔۔۔' یہ کہہ رانو وہاں سے بھاگ گئی۔

'بے حیا۔۔۔عقل ہی نہیں اس میں تو۔۔۔ تجھے پتہ ہے مہرو کی ماں، شیرو کی پھوپھی زاد بہن تھی۔ حساب لگا۔۔ کیا رشتہ بنا ان کا۔۔۔ جو منہ میں آئے بک دیتی ہے۔' خالہ چیختی رہ گئی۔

'شیرو شرم سے نگاہیں جُھکائے وہیں بیٹھا رہا۔۔۔خالہ کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے اجازت چاہی۔

'خالہ۔۔۔میں چھت پہ چہل قدمی کرلوں۔۔۔؟' شیرو نے پُوچھا۔

'ہاں میرے شیر۔۔۔جا۔۔۔شوق سے جا۔۔۔' خالہ نے کہا۔

'اچھا سُن۔۔۔' خالہ نے آواز دی۔

'موسم اچھا ہے۔۔۔اگر تو کہے تو تیری چارپائی چھت پہ کرادوں۔ وہیں سو جانا۔۔۔؟' خالہ نے پُوچھا۔

'ہاں خالہ۔۔۔جو مناسب لگے۔' شیرو یہ کہہ کر چلا گیا۔

....

مہرو اور رانو دونوں صحن میں چار پائی پر لیٹی باتوں میں مصروف تھی۔ خالہ برآمدے میں چارپائی بچھائے گہری نیند میں تھی۔

رانو کبھی دائیں کروٹ لیتی تو کبھی بائیں۔۔۔مگر مہرو کو ہمیشہ آسمان کی طرف دیکھتے پایا۔۔۔۔۔

'مہرو جی۔۔۔۔' رانو نے کہا۔

'جی ۔۔۔' مہرو نے جواب دیا۔

'کیا سوچ رہی ہو؟' رانو نے پُوچھا۔

'کچھ نہیں ۔۔۔ کیوں ۔۔۔' مہرو نے پُوچھا۔

'اتنی گُم سُم خاموشی سے آسمان کی طرف دیکھے جا رہی ہو۔کوئی بات ہی کر لو۔' رانو نے کہا۔

'تم سنا دو کسی سہیلی کا قصہ ۔۔۔' مہرو نے کہا۔

'وہ جو صفیہ ہے ناں؟' رانو نے کہا۔

'ہاں، انیلہ کی بہن ۔۔۔ اُس کی منگنی ٹوٹ گئی۔' رانو نے کہا۔

'او ہو ۔۔۔ یہ تو بہت دُکھ کی بات ہے۔' مہرو نے کہا۔

'ویسے اس کا منگیتر بہت خوبصورت تھا۔ میں بہت جلتی تھی ۔ خود وہ بس ٹھیک تھی، آپ نے دیکھی ہوئی ہے ناں ۔۔۔؟' رانو نے کہا۔

'ایسے نہیں کہتے رانو ۔۔۔ اور ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔' مہرو نے کہا۔

'لو جی ۔۔۔ اماں مجھے ہر وقت جوانی کے طعنے دیتی رہتی ہے اور آپ ۔۔۔' رانو نے کہا۔

'جوانی کے طعنے نہیں دیتیں، بس اشاروں میں سمجھاتی ہیں، پہلے خالو کے علاوہ کوئی مرد نہیں ہوتا تھا اور خالو سے اب کیا پردہ تمہارا، مگر اب وہ سمجھاتی ہیں کہ سنبھل کے اُٹھا بیٹھا کرو، سوچ کے بولا کرو۔' مہرو نے کہا۔

رانو اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی، گھٹنوں پر تھوڑی رکھتے ہوئے کہنے لگی، 'اور اب کیا ہوا ہے؟'

'اب ۔۔۔' مہرو نے دائیں جانب کروٹ لیتے ہوئے کہا، 'شیرو ہوتا ہے گھر میں، تمہارا دوپٹہ کہیں ہوتا ہے، خود تم کہیں، بال کھول کر پھرنا، یہ ہر وقت کی پائل ۔۔۔ اب تم

بڑی ہوگئی ہو۔' مہرو نے کہا۔
'دیکھا دیکھا۔۔۔ ابھی خود ہی کہا عمر دیکھو اور خود ہی کہا کہ اب تم بڑی ہوگئی ہو۔' رانو ہنسنے لگی۔
'ویسے مہرو آپی ایک بات کہوں؟' رانو نے کہا۔
'ہاں بولو۔۔۔' مہرو نے کہا۔
'ویسے شیرو ہے بہت حسین۔۔۔' رانو نے کہا۔
مہرو ایک دم اُٹھ کے بیٹھ گئی۔ 'ہاں ہے تو۔۔۔ پھر؟؟'
'پھر کیا، اماں کہہ رہی تھیں کہ سب خاندان والے شیرو کو اپنی اپنی لڑکی دینے کو تیار ہیں۔ پر خالہ کا دِل یا تو ماموں کے گھر ہے یا ہمارے۔' رانو نے کہا۔
'ویسے اگر میری منگنی ہو جائے ناں شیرو سے۔۔۔۔ میں بھی سب سہیلیوں کو دکھاؤں گی کہ دیکھو میرا بندہ مجھ سے بھی زیادہ حسین ہے۔۔۔' رانو اپنے ہی خیالوں میں بولتی چلی گئی۔
'یہ کیا۔۔۔ بارش۔۔۔' بارش کی بوندوں نے جیسے ہی مہرو کو چُھویا اس نے کہا۔
'ہاں مہرو باجی۔۔۔ کہا تھا نہ کہ بارش آئے گی۔' رانو ہنسنے لگی۔
'خدا بھی کچھ زیادہ ہی مہربان ہے۔۔۔' مہرو نے ہنستے ہوئے کہا۔
'چلو یہ بستر اُٹھاؤ۔۔۔ میں چارپائیاں سائیڈ پہ کرلوں۔' مہرو نے رانو سے کہا اور چارپائی اُٹھانے لگی۔
چارپائیاں اُٹھا کر رکھیں اور رانو کو سونے کے لئے کہا جیسے ہی خود سونے لگی یاد آیا کپڑے چھت پر ہیں۔ کپڑے اُٹھانے کی غرض سے ننگے پیر ہی چھت کی طرف دوڑی۔
شیرو چھت پہ کھڑا بارش کے مزے لے رہا تھا، چارپائی اور بستر پہلے ہی اُٹھا چکا

تھا۔کپڑے تار سے اُتار کر چھت پر پچھلے کمرے کے برآمدہ میں رکھ دیئے۔
مہرو چھت پر قدم رکھتے ہی بولی۔۔۔'کپڑے۔۔۔'
شیرو ہنسنے لگا۔۔۔'کپڑے،پچھلے کمرے میں،بستر بھی وہیں اور چارپائی وہ آپ کے سامنے،کچھ بھی نہیں بھیگ رہا۔'
'میں تو دوڑی دوڑی آئی کہ پھر نہ دھونے پڑ جائیں سارے کپڑے۔'مہرو نے کہا۔
'رانو جیت گئی۔۔۔'شیرو نے اچانک کہا۔۔۔
'مطلب'؟مہرو نے پوچھا۔
'بارش ہوگئی۔۔۔'اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔
'ہاں۔۔۔'مہرو نے جواب دیا۔
مہرو نیچے جانے کے لئے پلٹی تو ایک دم شیرو سامنے آ گیا۔
'آپ کہیں جارہی ہیں؟؟'شیرو نے پُوچھا۔
'ہاں،نیچے'۔مہرو نے کہا۔
'کچھ دیر یہیں رُکیں ناں،مجھ سے باتیں کریں جیسے پچھلی بار کی تھیں،جیسے ہم پہلے کرتے تھے۔'شیرو نے اس کے سامنے کھڑے کہا۔
'باتیں،اب کیا باتیں کروں؟؟'مہرو نے پُوچھا۔
'کچھ بھی۔'شیرو نے کہا۔
'اب تم بڑے ہو گئے ہو تب بچے تھے،تو اِدھر اُدھر کی،جھوٹی سچی کہانیاں سُنا کر تم لوگوں کو بہلا دیتی تھی۔اب کیا باتیں کروں۔'وہ دونوں بارش میں چھت پر ٹہلنے لگے۔
شیرو ہنسنے لگا۔ایک بات بتاؤں۔۔۔شیرو نے کہا۔
'میں گاؤں میں ایک ایڈونچر کر کے آیا ہوں۔'شیرو نے کہا۔

’کیا انڈونیچر؟‘ مہرو نے پُوچھا۔

شیرو نے سارا قصہ مہرو کو بیان کر دیا۔ بارش ایک دم تیز ہوئی تو دونوں شیڈ کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ گفتگو کا سلسلہ طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔

’آپ کو کیا لگتا ہے کہ بابا چراغ دین کیوں جاتا ہوگا؟‘ شیرو نے پُوچھا۔

’کچھ کہہ نہیں سکتی۔‘ مہرو نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

’کالا جادو ہی تو نہیں ہوتا صرف قبرستان میں۔ لوگ اپنے پیاروں سے بھی ملنے جاتے ہیں۔‘ مہرو نے کہا۔

’پیارے۔۔۔‘؟ شیرو نے مُسکراتے ہوئے کہا۔۔۔

’وقت بہت ہو گیا ہے اب چلیں نیچے؟؟‘ مہرو نے کہا۔

’ہاں، چلتے ہیں۔۔۔ آپ کو نیند آ رہی ہوگی۔ مجھے تو ویسے ہی رات دیر تک جاگنے کی عادت ہے۔‘ شیرو نے کہا۔

....

نازلی۔۔۔ لان میں کھڑی پودوں کو پانی دیتے ہوئے۔۔۔

آج بھی وہ اس پہلی کلاس میں گُم تھی جب سب اپنا اپنا تعارف تو ایک دوسرے کو کروا رہے تھے مگر دکھاوا ایسے کر رہے تھے کہ ٹیچر کے علاوہ کسی سے مطلب نہیں۔

وہ مُسکرائی۔ پانی کا پائپ وہیں پھینکتے ہوئی لان میں موجود کُرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ اپنی ڈائری کھولی اور کچھ لکھنے لگی۔

’دس بجے کے قریب کا وقت تھا۔ دس بج کر بیس منٹ شاید۔ پروفیسر سلمان، بڑی گول عینک لگائے ہوئے، ہاتھ میں ڈاکومنٹس والا بیگ تھامے اندر داخل ہوئے۔

جی۔۔۔ سب کو سلام۔۔۔۔ پروفیسر سلمان نے کہا۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو پڑھاؤں، اپنا اپنا تعارف کروایئے۔

اُس نے اپنی لٹ کو انگلیوں پر بل دیتے ہوئے کچھ سوچا اور پھر لکھنے لگی۔

وہ پہلی قطار میں، پہلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ نیلے رنگ کی شرٹ اور کالی پتلون پہنے، انگلیوں میں قلم دبائے، ٹانگ پر ٹانگ رکھے، ہر چیز سے بے خبر وہ اپنی ہی دُھن میں بیٹھا تھا۔ جو بھی کلاس میں داخل ہوتا سب سے پہلے نظر اُس پر ٹکتی اور کچھ دیر کے لئے جم جاتی پھر خود پہ قابو پا کر آگے بڑھنا پڑتا تھا۔ کاغذ آگے رکھے نہ جانے اُس دِن وہ کیا لکھ رہا تھا۔ میں بھی داخل ہوئی تو پہلی نظر اس پر ہی پڑی۔ باقی لڑکیاں مجھ سے مختلف تھیں، دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان کا بیک گراؤنڈ کیا ہے۔ سفید رنگ کی شرٹ اور نیلی جینز، گلے میں مفلر ڈالے اور آنکھوں سے ذرا اوپر سن گلاسز ٹکائے جب میں پہلی بار کلاس میں داخل ہوئی تو اس کو دیکھ کر وہیں جم گئی۔ باقی کلاس کی نظریں مجھ پر تھیں مگر اس کی نظر زمین پر۔ میں یہ نہیں کہتی کہ بہت شرم وحیا والا ہے۔ ہاں، مگر یہ بھی نہیں کہتی کہ لڑکیوں کو دیکھ کر اس کی رال ٹپکتی ہے۔ حسن نے شاید اس کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا ہے کہ کوئی اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔

جب کلاس کا تعارف ہونا تھا تو اُسی سے ہونا تھا۔ میں کیا تمام لڑکیاں، لڑکے بس اُسی کے تعارف کے انتظار میں تھے۔ تین ہی تو لوگ تھے کلاس میں، وہ، میں اور بابر۔ بابر اپنے مخصوص دیہاتی انداز، لمبی لمبی مونچھوں اور شلوار قمیض کے حوالے سے مشہور تھا۔ تعارف کا وقت آیا تو پروفیسر نے آگے سے تعارف لینے کی بجائے، آخری نشست سے شروع کیا۔

ثمینہ، رُقیہ، فاطمہ، مہ جبین، نصرین، صائمہ، علی، عاطف، جاوید، ثاقب، منصور، بابر سب نے باری باری اپنا تعارف کروایا۔ جب میری باری آئی تو میری خاص اردو اور انگریزی ایکسنٹ کی وجہ سے کوئی مُڑ مُڑ کر دیکھنے لگا تو کوئی نظر اٹھا اٹھا کر، وہ شیر دل اپنی کُرسی پر، نظر پروفیسر پر ٹکائے جما رہا۔ پروفیسر نے تو بولا بھی کہ برخوردار تُم نہیں اُس خاتون کو

جاننے میں دلچسپی رکھتے۔ایف سی کی گریجویٹ ہے، خاصی پڑھی لکھی ہے۔ پرفیسر نے ہنستے ہوئے کہا۔

'کسی کو جاننے کے لئے نظر ٹکا کر دیکھنا ضروری نہیں ہوتا سر، آج تو نام معلوم ہور ہے ہیں، جاننے میں توصدیاں لگتی ہیں۔' اُس کے جواب نے اور بھی حیران کر دیا۔

'بہت خوب بیٹا۔۔۔' پروفیسر نے کہا۔

سر سلمان دیکھنے میں بہت سخت طبیعت کے انسان لگتے تھے۔ کبھی کبھار ہنستے، مُسکراتے تھے مگر نہایت شفیق انسان تھے۔ یہ بات وقت کے ساتھ ساتھ معلوم ہوئی۔

جب باری اس کے تعارف کی آئی تو لڑکیاں ایک دوسرے کو اشارے کرنے لگیں، کوئی ساتھ والی کو پاؤں مارتا تو کوئی کُہنی، میں اس سارے منظر سے محظوظ ہو رہی تھی۔

نام کی طرح اس کی آواز بھی میٹھی تھی۔ جیسے ہی اس نے اپنا تعارف کرایا، مہ جبین تو باقاعدہ شرمانے لگی۔ لکھتے ہوئے وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔

'ہاں جی۔۔۔کیوں ہماری بیٹی اکیلے اکیلے ہنس رہی ہے؟' اتنے میں نازلی کے ابا لان میں داخل ہوئے۔ بریف کیس ملازم کو پکڑایا اور آگے بڑھ کر نازلی کے سر پر پیار کرنے لگے۔

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

'کیسے ہیں ابا آپ؟؟' نازلی نے پُوچھا۔

'I am good, handsome as always' ابا نے جواب دیا۔

'yes, you are.. becuase you have such a beautiful daughter' نازلی نے کُرسی گھسیٹتے ہوئے کہا۔

'کیا پلان ہے رات کا؟' ابا نے پُوچھا۔

'کچھ خاص نہیں۔' نازلی نے جواب دیا۔

'تو پھر۔۔۔کھانے پہ چلتے ہیں؟؟' ابا نے پوچھا۔۔۔
'ہممم م۔۔۔سوچا جا سکتا ہے'۔نازلی نے کہا۔

....

رسول آباد۔۔۔

'آج دِن میں کتنی گرمی تھی ناں؟؟' شیرو نے کہا۔ وہ چھت پر کھڑا گاؤں کے نظارے کر رہا تھا۔ خالہ سلمٰی ،مہرو اور رانو نیچے صحن میں بیٹھی تھی۔ رانو ہمیشہ کی طرح بال چار پائی سے نیچے لٹکائے ،دوپٹہ ایک طرف ٹکائے ،آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ خالہ کبھی اپنی خوبصورت بیٹی کو دیکھ کر خوش ہوتی تو کبھی چھت پر چڑھے حسین شیرو کے صدقے واری جاتی۔

'ہاں ،گرمی تو بہت تھی ،آج تو یہاں پہلا دِن دیکھا ہے گرمی کا۔۔۔ورنہ لگ پتا جا تا'۔خالہ نے اپنی ٹانگ سیدھے کرتے ہوئے کہا۔

'خالہ،اب پیر کچھ ٹھیک ہوا؟؟' شیرو نے پوچھا۔

'ہاں ،بہتر ہے پہلے سے۔۔۔بس وزن نہیں ڈال سکتی۔۔۔ چلا ہی نہیں جاتا ٹھیک سے'،خالہ نے کہا۔

'کیا ضرورت ہے خالہ چلنے پھرنے کی ،آرام کریں آپ۔ جو کام بھی ہو رانو کو بتایا کریں۔ بہت کام چور ہے یہ'،شیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

رانو ایک دم اُٹھ کے بیٹھ گئی، 'میں کام چور ہوں؟؟ اچھا۔۔۔صحیح۔۔۔کل پانی کس نے دیا تھا؟؟ اور پرسوں چائے'۔۔۔؟ رانو نے بال سمیٹتے ہوئے کہا۔

'چل مہرو ،سہارا دے بیٹی۔۔۔اندر چھوڑ۔۔۔نیند بہت آ رہی ہے۔اور تو رانو، شیرو سے پوچھ لے باداموں والا دودھ چاہیئے، چائے یا کچھ اور۔۔۔(خالہ اوپر شیرو کی

طرف دیکھ کر مُسکرانے لگی) اور جو بھی چاہئے ہو خود بنا کے دے دینا۔ بہت کام چور ہے تو۔۔۔(خالہ ہنسنے لگی)۔۔۔

'چل آ۔۔۔سہارا دے۔۔۔'خالہ مہرو سے کہنے لگی۔

خالہ مہرو کو لے کر اندر چلی گئی۔

'جلدی آیئے گا، پھر رانو کے ہاتھ کی سردائی پیئں گے۔'شیرو نے مہرو کو آواز دی۔

مہرو نے مُسکرا کر شیرو کی طرف دیکھا۔

'اچھا۔۔۔تو آپ کو سردائی چاہئے۔۔۔؟'رانو نے اپنی پازیب سیدھی کرتے ہوئے پوچھا۔

'جی جی۔۔۔باداموں والا دودھ ہی، سردائی کہہ لیجئے بے شک۔۔۔'شیرو نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

'میں واک کر رہا ہوں، اپنی مہرو باجی کو بھی اوپر بھیج دینا اور تم چار گلاس سردائی کے لے آنا۔۔۔دو میرے، دو مہرو باجی کے۔'شیرو نے کہا اور واک کرنے لگا۔

رانو نے پہلے اپنی تیاری پر دھیان دیا۔۔۔اور پھر سردائی کی تیاری شروع کی۔

مہرو نے سہارا دیتے ہوئے خالہ کو اندر کمرے میں چھوڑ دیا۔ وہ جیسے ہی مُڑی خالہ نے آواز دی۔

'مہرو۔۔۔'

'جی خالہ۔۔۔'مہر نے جواب دیا۔

'بیٹی بات سننا ذرا۔۔۔'خالہ نے کہا

مہرو ان کے قریب جا کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔۔۔'یہ شیرو اچھا لڑکا ہے ناں؟؟'خالہ نے پوچھا۔

'جی خالہ۔۔۔آپ کو کوئی شک۔۔۔'؟ مہرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

'مجھے لگنے لگا ہے کہ وہ اب رانو میں دلچسپی لینے لگا ہے اور ویسے بھی اپنی رانو ہے بھی تو جوان، خوبصورت ، پورے خاندان میں ایسی حسین اداؤں والی لڑکی کوئی نہیں ہے۔گوری چٹی ،اونچی لمبی ، بال دیکھیں ہیں، مجھے تو لگتا ہے شیرو اس کو پسند کرنے لگا ہے۔ تبھی تو جب آیا تو کہنے لگا بس دو روز بعد چلا جاؤں گا۔اور اب ایک ہفتہ ہو گیا،خوشی خوشی ٹھہر گیا ہے'۔

خالہ خوشی سے مہرو کو بتانے لگیں۔

'جی خالہ، پر وہ خالو سے ملنے کے لئے رُکا ہے شاید۔'مہرو نے کہا۔

'یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے میں نے۔۔۔خوب سمجھتی ہوں۔۔۔(خالہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھیں) ہے بھی شہری بابو۔۔۔میری رانو تو ویسے ہی شہری لگتی ہے۔اگر آپا نے اسی سال کی تاریخ بھی مانگ لی تو دے دوں گی۔' خالہ نے کہا۔

'خالہ۔۔۔رانو ابھی چھوٹی ہے اور۔۔۔'مہرو نے کچھ کہنا چاہا۔

'دیکھ تو بھی میری بیٹیوں کی طرح ہے۔اسی لئے تجھ سے مشورہ لے رہی ہوں۔ پہلی بار میں ہی ہاں کر دوں آپا کو یا ذرا ایک دو بار نہ کروں؟؟' خالہ سلمٰی نے پُوچھا۔

'خالہ۔۔۔ مجھے لگتا ہے ذرا انتظار کرنا چاہئے،شیرو اس کو ابھی بچی سمجھتا ہے، تبھی ہلکا پُھلکا مذاق کر لیتا ہے۔'مہرو نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

'ویسے عادت کا اچھا ہے خالہ۔۔۔'مہرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

'تیرے لئے بھی کوئی پڑھا لکھا گھرانہ ڈھونڈ رہی ہوں۔ اسی لئے دیر ہو رہی ہے۔یہ نہ سمجھنا کہ خالہ سوتیلا پن کر رہی ہے۔' خالہ نے اس کے ہاتھ پہ شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

'بس اب رانو کو بھی گھر داری سکھا دے، اپنے جیسا بنا دے۔' خالہ نے اس کے

ماتھے پہ پیار کرتے ہوئے کہا۔

'جی خالہ۔۔۔ضرور۔۔۔' مہرو نے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

'اچھا دیکھ لینا سردائی ٹھیک بنی ہے۔ضرورت پڑے تو ان کو چھت پہ چھوڑ آنا۔ مگر چکر لگاتی رہنا۔۔۔' خالہ ہنسنے لگی۔

'جی خالہ۔۔۔' مہرو نے کہا اور چلی گئی۔

باہر نکلتے ہی شیرو کو دروازے پہ پایا۔۔۔

'کہاں تھیں اتنی دیر سے آپ۔۔۔ کب سے بُلا رہا ہوں۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'اندر آواز نہیں آتی ناں۔۔۔اب بتاؤ۔۔۔' مہرو نے کہا۔

'اوپر آ جائیں، واک کریں گے تب تک یہ مس رانو ہمارے لئے باداموں والا دودھ تیار کر لیں۔' شیرو نے رانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

'ایسا کرو تم دونوں جاؤ میں سردائی بنا لاتی ہوں۔۔۔' مہرو نے کہا۔

'ہاں یہ ٹھیک ہے مہرو باجی۔۔۔' رانو فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔

'جی نہیں۔۔۔تم یہیں بیٹھو رانو۔۔۔آپ آئیں ناں۔۔۔' شیرو نے مہرو سے کہا۔

'اچھا چلو۔۔۔رانو اچھا سا بنانا۔۔۔' مہرو نے رانو سے کہا اور چھت پر چل دی۔

'چاند کے دن گھٹتے جا رہے ہیں۔۔۔' شیرو نے چھت پر پہلا قدم رکھتے ہی کہا۔

'ظاہری بات ہے ہر چیز سدا بہار تو نہیں ہے'۔مہرو نے کہا۔

'واقعی، ہر عروج کو زوال اور ہر زوال کو عروج ہے۔ایک دِن آپ کے حق میں تو دوسرا آپ کے Against۔۔۔۔' شیرو نے مُسکراتے ہوئے مہرو کی طرف دیکھا۔

'لیکن یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ چاند کا گھٹنا، اس کے against بھی ہے اور اس کے

Favour میں بھی۔ چاند گھٹے گا تبھی تو پُورا بھی ہوگا ناں۔۔۔ ہمیشہ گول رہے گا تو پھر چودھویں کا مزہ کیا۔۔۔؟' مہرو نے کہا۔

'ہاں ناں۔۔۔ یہ تو اچھی بات کہی آپ نے۔۔۔ مگر چودھویں کا چاند اتنا اچھا نہیں لگتا جتنا ایک ہلکا سا پہلی کا نشان لگتا ہے۔' شیرو نے کہا۔

'وہ بھی کوئی چاند ہوتا ہے بھلا؟؟' مہرو نے کہا۔

'ہاں ناں۔۔ سب چاند ہی کہتے ہیں اس کو بھی۔ آدھا ہو یا پُورا، چاند چاند ہوتا ہے۔ بات تو تب ہی کہ آدھے ادھورے چاند کو اپنی محبت اور توجہ سے مکمل کردو۔' شیرو نے کہا۔

'مجھے تو گول اور پورا چاند ہی پسند ہے۔ اور مکمل چیزیں ہی اچھی لگتی ہیں۔۔۔ ہر چیز کو Perfect ہونا چاہئے۔' رانو نے چھت پر چڑھتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس پہ تین گلاس اور ایک جگ تھا۔

'آ گیا باداموں والا دودھ۔۔۔' رانو نے اعلان کیا۔

'کوئی بھی چیز مکمل اور پرفیکٹ نہیں ہے۔ مکمل اور پرفیکٹ صرف ایک ہی ذات ہے تبھی تو کہتا ہوں کہ تُم گڑیا ہو چھوٹی ابھی۔ نہ دنیا کی سمجھ نہ دنیا داری کی، باقی فلسفہ کیا خاک سمجھو گی۔' شیرو نے ایک گلاس میں دودھ ڈال کر مہرو کو تھمایا۔

'یہ لیجئے۔۔۔'

'تُم لوگی رانو؟؟ تم نیچے آدھا جگ پی کے آئی ہوگی۔۔۔' شیرو نے اس کی ناک کھینچتے ہوئے کہا۔

'یہ جو تم کتابیں اپنے ساتھ لائے ہو، وہ سب تم نے پڑھ رکھی ہیں؟؟' مہرو نے پُوچھا۔

'جی۔۔۔ کیوں؟' شیرو نے جواب دیا۔

'آپ کو چاہئے کوئی تو رکھ سکتی ہیں آپ۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'نہیں۔۔۔ یہ سب دو تین سال پہلے میں پڑھ چکی ہوں۔ کتابیں میرے پرانے گھر میں پڑی ہیں۔ سو چا تھا کبھی چکر لگا تو لاؤں گی۔' مہرو نے کہا۔

'ویسے اتنے باذوق لگتے تو نہیں ہو تُم۔۔۔' مہرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

'بس یہی قصور ہے کہ لگتا نہیں ہوں، ورنہ پڑھتا میں بہت ہوں۔۔۔' شیرو نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔

'جانتی ہیں۔۔۔ پہلے سمسٹر میں کیا ہوا۔ میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ ایک لڑکی آئی اور کہنے لگی، مشراز صاحب! کیا آپ کی یہ کتاب دیکھ سکتی ہوں؟ میں نے کہا جی ضرور۔ کتاب ہی ہے، شوق سے دیکھئے، اب میں عادت سے مجبور مختصر جواب نہ دے سکا۔ وہ کتاب تھی مولانا ابوالکلام آزاد کی۔ خاصی مشکل کتاب تھی۔ کہنے لگی اس کی جِسٹ بتا سکتے ہیں آپ۔ میں نے کہا کہ آپ لے جایئے، پڑھ کے واپس کر دیجئے گا۔ مجھے بھی اچھا لگے گا اور آپ کو بھی۔ جسٹ تو میں بتا دوں مگر اصل مزہ تب ہے جب قاری خود پڑھے۔ بھنویں اُچکا کر دیکھنے لگی پھر کہا، آپ کتابیں پڑھتے بھی ہیں یا بس شوقیہ ہاتھ میں پکڑ کے پھرتے ہیں۔ یقین کریں، میں طیش میں آ گیا میں نے پورا ڈیڑھ گھنٹہ اس لڑکی کو اس کتاب کی Summary کیا اس کی تشریح بھی بیان کر دی۔ چہرے سے تو لگ رہا تھا بہت شوق سے سُن رہی ہے، مُسکرا رہی تھی مگر یقین کیجئے اس کو سمجھ ایک لفظ نہیں آیا تھا، پھر کتاب لے گئی کہ پڑھ کے واپس کر دوں گی۔ میں نے کہا ضرور پڑھئے گا، اب آپ سے summary پُوچھوں گا اور آپ کو مجھے بتانا ہو گا۔' شیرو ابھی بات کر رہا تھا کہ رانو نے کہا۔۔۔

'مہرو باجی میرے بال باندھ دو، بہت تنگ کر رہے ہیں۔۔۔'

'آؤ رانو۔۔۔ بیٹھو۔۔۔' مہرو نے نہایت پیار سے اُسے چھت پر پڑے مُوڑھے پر بٹھایا اور خود کھڑے ہو کر اس کے بال باندھنے لگی۔'

'آپ ادھر بیٹھ جایئے۔۔۔'شیرو نے اپنی کرسی مہرو کی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔

'نہیں تم بیٹھو، بیٹھ کر اس کے بال نہیں بنیں گے۔'مہرو نے کہا۔

'تم بتاؤ۔۔۔پھر کیا ہوا۔۔۔'مہرو نے پوچھا۔

'پھر کیا، وہ سمجھ رہی تھی کہ مجھے کچھ آتا جاتا نہیں ہے۔ مگر میں نے بھی منہ توڑ جواب دیا۔'شیرو ہنسنے لگا۔

'کیا بور باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ۔۔۔رانو نے شکل بناتے ہوئے کہا۔

'مجھے نیند آ رہی ہے میں جا رہی ہوں۔۔۔'رانو نے کہا۔

'بیٹھو نا رانو۔۔۔'شیرو نے کہا۔

'نہیں میں جا رہی ہوں۔۔۔'رانو نے جوتے پہنے اور نیچے چلی گئی۔

'آپ سنائیں، آپ کی کالج لائف کیسی تھی؟'شیرو نے پوچھا۔

'بہت اچھی تھی، اچھی اچھی سہیلیاں، تمام ٹیچرز، پھر پڑھنا، گھومنا پھرنا، سب ساتھ ساتھ لگا رہتا تھا۔۔'مہرو نے کہا۔

'یعنی آپ نے بھی بہت انجوائے کیا۔'شیرو نے کہا۔

'ہاں۔۔۔بہت۔۔۔'مہرو نے کہا۔

'آخری دِنوں میں اماں بیمار ہو گئی تھیں، بس سارا وقت ادھر لگ جاتا تھا۔ کالج ٹھیک سے جا نہیں سکی مگر دوستوں نے بہت ساتھ دیا۔'مہرو نے کہا۔

اب کہاں ہیں آپ کی سہیلیاں، مطلب کس شہر میں ہیں؟؟'شیرو نے پوچھا۔

'ہم م م م۔۔۔کوئی سرگودھا، کوئی شیخوپورہ اور ایک لاہور میں بھی ہے۔'مہرو نے بتایا۔

'لاہور والی سہیلی سے تو ملوا سکتے ہیں آپ کو۔۔۔'شیرو نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

'ہاں۔۔۔مِل تو سب سے سکتی ہوں۔۔۔مگر پتہ نہیں کب جاؤں گی۔ خالہ جا

نہیں سکتیں اور خالو تو شہر ہی ہوتے ہیں زیادہ۔۔۔‘ مہرو نے کہا۔

’اگلی بار جب آؤں گا تو آپ ساتھ چلیئے گا۔۔۔ پھر آپ کو لاہور بھی گھماؤں گا اور سہیلیوں سے بھی ملادوں گا۔‘ شیرو نے مہرو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’ہاں۔۔۔ دیکھیں گے۔۔۔‘ مہرو نے جواب دیا۔

’اچھا آپ کو شاعری پسند ہے؟؟‘ شیرو نے پُوچھا۔

’لکھنا یا پڑھنا؟؟‘ مہرو نے سوال کیا۔

’کچھ بھی۔۔۔‘ شیرو نے کہا۔

’ہاں پڑھنا اچھا لگتا ہے۔۔۔‘ مہرو نے کہا۔

’مجھے بھی۔۔۔‘ شیرو نے اپنی پسند بتاتے ہوئے کہا۔

’اچھا چلو اب رات بہت ہو چکی ہے۔ تم بھی سو جاؤ۔۔۔ میں چلتی ہوں۔ بارش ہوئی تو نیچے آ جانا۔ تمہارے کمرے میں بھی بستر تیار ہے۔‘ مہرو نے کہا اور چل دی۔

’اور اگر نہ ہوئی تو؟؟ شیرو نے پیچھے سے آواز دیتے ہوئے پوچھا۔۔۔

’تو کھلادوں گی جلیبی۔۔۔‘ اور وہ دونوں ہنسنے لگی۔۔۔

....

’اچھا خالہ۔۔۔ بہت شکریہ آپ کی مہمان نوازی کا۔۔۔ مجھے بہت اچھا لگا یہاں آ کر، آیا تو میں دو، تین دِن کے لئے تھا مگر ایک ہفتہ یہیں ہو گیا۔‘ شیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

’ہائے شکریہ کیسا، میرے بیٹے۔۔۔ بس میرا پیر خراب تھا ورنہ تجھے اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے کِھلاتی، خود پُورا گاؤں گھماتی۔۔۔ مگر اگلی بار پکا۔۔۔۔ تجھے پُورا گاؤں گھماؤں گی، مزے مزے کے کھانے کِھلاؤں گی پھر تو مہرو کے ہاتھ کا ذائقہ بھول ہی جائے گا۔‘ خالہ نے مہرو کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

’پھر تو ضرور آؤں گا۔ اور تب تک تُم بھی کچھ سیکھ لینا رانو گُڑیا۔۔۔ (اس نے گڑیا پر زور دیتے ہوئے کہا) اور شہر سے کوئی چیز چاہیے ہو تو بتانا۔ میں بھجوا دوں گا۔‘ شیرو نے کہا۔

’ہاں مجھے لاہور سے ایک جوڑی پازیب کی چاہیے اور۔۔۔۔ اور۔۔۔‘ رانو سوچنے لگی۔

’تم سوچ لو اچھی طرح۔۔۔ آپ بھی بتا دیں آپ کو کیا چاہیے، بلکہ اگلی بار تو آپ کو لاہور لے کے جانا ہے آپ کی سہیلیوں سے ملوانے۔‘ شیرو رانو سے کہنے لگا۔

’خالہ آپ کے لئے تو اچھا سا جوڑا بھجواؤں گا، اپنی پسند کے رنگ کا۔۔۔‘ شیرو نے کہا۔

’جیتا رہ، سلامت رہ، شاد و آباد رہ۔۔۔‘ خالہ ایک ہی سانس میں ڈھیروں دعائیں دے گئی۔

’آپ کو خط بھیجتا رہوں گا، خالہ کا حال احوال، گاؤں کی صورت حال اور حیدر کے بارے میں ضرور بتائیے گا، جب سے نانی کی طرف گیا پلٹ کر آیا ہی نہیں۔‘ شیرو نے کہا۔

’ہاں اب تو تیرے خالو ٹیلی فون بھی لگوانے لگے ہیں۔ اسی مہینے لگ جائے گا، پھر مہرو تجھے نمبر دے دے گی۔‘ خالہ نے کہا۔

’وہ ایک ایک مہینہ اپنی نانی کے ہاں رہ کر آتے ہیں، کبھی ایک ماہ خالہ کے اور کبھی ایک پھوپھو کے۔‘ رانو نے کہا۔

’تُم بھی رہ کر آیا کرو ناں۔۔۔ ابھی چھٹیاں ہیں ناں؟؟ میں لاہور جا رہا ہوں گھر جاتا تو تمہیں لیتا جاتا۔۔۔ نائلہ بھی تُم سے مل کر بہت خوش ہوتی۔ بہت یاد کرتی ہے سب کو وہ بھی۔۔۔‘ شیرو نے کہا۔

'نہیں، اب کیا فائدہ، اگلی بار جب آپ جاؤ تو پھر جاؤں گی آپ کے ساتھ، ورنہ مزہ کیا آئے گا۔' رانو نے کہا۔

خالہ کبھی شیرو کو دیکھتی تو کبھی رانو کے صدقے واری جاتی۔۔۔

'نظر نہ لگے میرے بچوں کو کسی کی'۔ خالہ نہ کہہ ہی دیا۔

'اچھا خالہ، اب اجازت دیجئے اور دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔' شیرو نے کہا اور بیگ اُٹھا کر نکل گیا۔

....

اسلام آباد 2014ء

'موسم اچھا ہے آج، دیکھو دھوپ نکلی ہوئی ہے، باہر واک کرنے کو، گرم گرم دھوپ کو جی ترس گیا تھا۔' بوڑھے شخص نے کھڑکی کے بلائینڈز ہٹاتے ہوئے کہا۔

'کل ہی یہ کتاب لایا ہوں۔۔ پڑھ کے سناؤں؟' اُس نے نم آنکھوں سے اس کے مُسکراتے چہرے کی طرف دیکھا۔

لوگ اس کو خلیل صاحب کے نام سے جانتے ہیں۔۔۔

میری شہرت میرا ڈنکا۔۔۔

میرے اعزاز کا سُن کر۔۔۔

کہیں یہ نہ سمجھ لینا۔

میں چوٹی کا لکھاری ہوں۔۔۔

میں بزنس مین ہوں جانم۔۔۔

میں چھوٹا سا بیوپاری ہوں۔۔۔

میری آڑھت پہ برسوں سے جو۔۔۔۔

مہنگے داموں بکتا ہے

وہ تیرے غم کا سودا ہے۔۔۔

تیری آنکھیں تیرے آنسو

تیری چاہت تیرے جذبے

یہاں شیلفوں پہ رکھے ہیں

وہی تو میں نے بیچے ہیں۔۔۔

تمہاری بات چھڑ جائے

تو باتیں بیچ دیتا ہوں

ضرورت کچھ زیادہ ہو

تو یادیں بیچ دیتا ہوں

تمہارے نام کے صدقے

بہت پیسہ کمایا ہے

نئی گاڑی خریدی ہے

نیا بنگلہ بنایا ہے،

مگر کیوں مجھ کو لگتا ہے

میرے اندر کا بیوپاری

تمہی کو بیچ آیا ہے،

میں بزنس مین ہو جانم۔۔۔

میں بزنس مین ہوں جانم۔۔۔

خلیل الرحمٰن قمر

....

کھوٹہ۔۔۔

سبز گھاس کی نمی محسوس کرتے ہوئے اس پر اپنے نرم ملائم ہاتھ پھیرتے، وہ کبھی اپنے خیالوں میں ماضی کے دریچوں کو رقم کرتی تو کبھی لفظوں کی تلاش میں کچھ دیر ساکت ہو کر لان میں لگے فوارے کے پانی اور اس کی پھوار کو دیکھتی۔ وہ ایسے لفظوں کی تلاش میں تھی جو 'اس' کی شخصیت کو بخوبی بیان کر سکیں۔ اُس سے تعلق رکھنے والے ہر احساس کو وہ ایک لڑی میں پرو دینا چاہتی تھی جس کا ہر موتی پوری آب و تاب سے چمکے اور اتنا روشن ہو کہ اس کی شخصیت میں چھپی ساری تاریکی کو فنا کر دے۔ ساری سوچوں کو ایک کوزے میں بند کرتے ہوئے اس نے قلم کا سہارا لیا، وہ آپ بیتی نہیں بلکہ اپنے احساس رقم کر رہی تھی۔ وہ احساس جو خاص 'اُس' کے لئے تھے۔

پہلی کلاس میں تو صرف میری نظریں تُم پر جمی تھیں۔ میرے دِل اور سوچوں کے گرد ایک حصار تم نے تب قائم کیا جب زندگی کا فلسفہ یوں کھول کر دو لائنوں میں بیان کر دیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو، زندگی نہ ہو، کوئی کھیل، کوئی تماشا ہو۔ اُسی دِن فدا ہو گئی تھی اور جان ہتھیلی پر رکھ کر یوں بیٹھ گئی تھی کہ ابھی آؤ گے اور کہو گے کہ نازلی !! جان مانگوں تو کیا دو گی؟؟ مگر تمہاری ذات کی گہرائیوں کو جیسے جیسے چُھوتی گئی ویسے ویسے معلوم ہوا کہ جان تو تمہارے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ پھر تمہارا وہ جملہ یاد آیا کہ میں کوئی typical بندہ نہیں ہوں جو جان دینے کا یا جان مانگنے کا دعویٰ کروں۔۔۔ ایک محبت اپنی اپنی اور ایک جان اپنی اپنی۔۔۔ پُوری کلاس نے ایک قہقہہ لگایا۔ بس میں تھی جو تمہارے لفظوں اور تمہاری باتوں میں گُم تھی۔ تمہاری زندگی کا فلسفہ آج بھی یاد ہے۔

تُم ہمیشہ کی طرح پہلی قطار میں پہلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ میں اندر داخل ہوئی، پوری کلاس کی نظریں مجھ پر تھیں کیونکہ خلافِ معمول میں نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔

ڈھنگ سے مشرقی لڑکیوں کی طرح دوپٹہ لپیٹا ہوا تھا۔ بالوں کی چٹیاں کی ہوئی تھیں۔ دائیں کندھے پر بیگ لٹکا کر بائیں ہاتھ سے کتاب کو سہارا دیا ہوا تھا۔ سب نے دیکھا، مگر تم نہ جانے کن سوچوں میں گُم تھے۔ میں نے کئی بار تمہاری طرف دیکھا، تمہاری توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی کوشش کی مگر تم۔۔۔ اپنی دُھن میں مگن تھے۔ میری ڈائری میں ایک ایک واقعہ، ایک ایک قصہ بلکہ یوں کہو کہ ایک ایک لمحہ درج ہے۔ جب بھی کھول کر پڑھتی ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی پھر سے جی رہی ہوں۔ احساس ہی نہیں ہوتا کہ تمہاری یاد میں گُم ہوں، زندگی کا حصہ لگتا ہے سب، جو ایک فلم کی طرح چل رہا ہوتا ہے۔ اب کی بار ملاقات ہوگی ناں تو سب کو خفا کر کے تم سے دوستی کرلوں گی پھر چاہے کوئی کچھ بھی سوچے، مجھے کیا۔ تُم کیا سوچتے ہو اور تمہارے قریب کیسے آنا ہے مجھے تو یہ فکر دامن گیر رہتی ہے۔

....

گوکھووال (فیصل آباد)

چارسُو اندھیرا، کھیتوں کی ٹھنڈک، چاند کی چاندنی، مزار پہ لگی اگربتیوں کی خوشبو سے ماحول پُرشکوہ تھا۔ بابا چراغ دین ہاتھ میں لالٹین اُٹھائے کنویں کے پاس کھڑا تھا۔ لالٹین کنویں کے کنارے رکھا اور چراغوں کی بتیاں روشن کرنے لگا۔ شیرو وہاں بیٹھا خاموشی سے سب دیکھتا رہا۔ پھر اُس سے رہا نہ گیا اور پُوچھا، 'بابا جی، یہ چراغ آپ کیوں جلا رہے ہیں؟'

بابا چراغ دین نے ایک نظر اُس پہ ڈالی اور پھر واپس چراغ روشن کرنے لگا۔ کنویں کے گرد گھومتے ہوئے اُس نے سارے چراغ روشن کردیئے۔ پھر شیرو کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

لالٹین وہیں پر اُسی کونے میں پڑا رہا۔ آدھی رات میں صرف دو چیزیں پوری طرح روشن تھیں۔ ایک آسمان، جس کو چاندکی چاندنی نے روشن کیا ہوا تھا اور دوسرا کنواں، بابا فقیرے کے مزار کا مشہور کنواں جہاں منتیں مُرادیں لانے والے لوگ اپنا اپنا چراغ روشن کر کے اپنی مُرادیں پاتے تھے۔ آج سارے چراغ بابا چراغ دین نے خود روشن کیئے۔

'آج کے دن سب کو پتا ہے۔۔۔۔۔ سارے چراغ میں جلاتا ہوں۔ تیل ڈالتا ہوں، ان کی بتیوں کو روشن کرتا ہوں۔ آج کے دِن میرے مُرشد نے یہ کنواں مُجھے سونپ دیا تھا۔ اور کہا تھا۔۔۔ جا بشیرے۔۔۔ کردے سارے چراغ روشن۔۔۔ تیری منت نہیں پُوری ہونی۔۔۔ تُو نے رب کو راضی نہیں کیا۔ تب سے میرا نام بھی چراغ دین پڑ گیا۔ مُرشد نے چراغوں کو سونپ دیا۔ میں کون ہوتا ہوں۔ سوال کرنے والا۔۔۔' بابا چراغ دین نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

لالٹین اُٹھائی اور کھیتوں کی طرف جانے لگا۔ پھر اچانک رُکا اور مُڑ کر کہا، 'آجایا کر شیرو کبھی کبھار۔۔۔ مُرشد کے قدموں میں رہا کر۔ اللہ سے اُس کی رضا مانگا کر۔ سُکھی رہے گا۔'

'جی بابا جی'۔۔شیرو نے جواب دیا۔

صبح ہونے کو تھی، گاؤں کے مولوی نے فجر کی آذان دی۔ شیرو اذان کے بعد اُٹھا اور مزار کے ایک کونے میں جا بیٹھا۔ کچھ دیر بعد نہ جانے کیا سُوجھی وہ مزار کی جالی میں کھڑا ہو کر فاتحہ پڑھنے لگا۔ بہت سوچا کہ اللہ سے کیا مانگے مگر کچھ سمجھ ہی نہیں آیا۔ بس فاتحہ پڑھی اور واپس دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن بس چاچا چراغ دین کے گرد گھوم رہا تھا۔ سوچوں کے اسی بھنور میں اسے کب نیند آ گئی پتا نہ چلا۔ آنکھ کُھلی تو سورج پُوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ فوراً اُٹھا، منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور فوراً بس سٹاپ کی طرف بھاگا۔

تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے وہ بس سٹاپ تک جا پہنچا۔بس پہ چڑھنے لگا تو ایک جانی پہچانی آواز آئی۔

’بھائی شیرو۔۔۔تُو کب آیا۔۔۔آ کے جا بھی رہا ہے؟‘۔رفیق نے آواز لگائی۔

شیرو نظر انداز کرتے ہوئے بس پہ چڑھ گیا اور بس چلنے لگی۔رفیق پیچھے پیچھے بھاگنے لگا’۔۔۔شیرو۔۔۔۔شیرو۔۔۔یار رُک تو سہی۔‘

جب بس روک نہ پایا تو شیرو کے گھر کا رُخ کیا۔

دروازے پر پہنچتے ہی آوازیں دینے لگ،’خالہ۔۔۔خالہ۔۔۔۔میں رفیق دروازہ کھول۔۔۔‘

’ارے کون ہے۔۔۔صبح صبح۔۔۔‘شیرو کی ماں نے آواز دی۔

’خالہ میں فیکا۔۔۔‘رفیق نے جواب دیا۔

’ارے یوں بول ناں۔۔۔میں بھی کہوں کون رفیق آ گیا‘ خالہ نے دروازہ کھولتے ہی کہا۔

’خالہ۔۔۔۔خالہ۔۔۔۔‘رفیق نے کچھ کہنا چاہا۔

’تیری کیوں سانس پھولی ہوئی ہے۔آ جا اندر۔پانی پی لے۔۔۔‘ خالہ نے کہا۔

’خالہ میں نے پوچھنا تھا کہ شیرو آیا تھا۔۔۔مِل کے بھی نہیں گیا۔‘رفیق نے اندر آتے ہوئے کہا۔

’سٹھیا گیا ہے کیا؟؟‘ خالہ نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

’سچ کہہ رہا ہوں خالہ۔۔۔‘رفیق نے کہا۔

’نائلہ۔۔۔۔پانی کا گلاس لا۔۔۔ایسے کر پیالے میں لے آ۔۔۔یہ فیکا پاگل ہو گیا ہے۔‘شیرو کی ماں نے کہا۔

’خالہ میں پوچھ رہا ہوں۔۔۔کیا شیرو آیا تھا؟‘ رفیق نے کہا۔

'ارے خالہ بھی تجھ سے کچھ پُوچھ رہی ہے۔کیا تو سٹھیا گیا ہے؟؟ دماغ گھوم گیا ہے؟' شیرو کی ماں نے کہا۔

نائلہ پانی کا پیالہ پکڑاتے ہوئے ہنسنے لگی۔

'بھائی۔۔۔ بھائی شیرو آنے سے پہلے اطلاع دیتا ہے۔۔۔ پھر اماں سارا دن ٹائم پوچھتی رہتی ہے۔پھر اماں یہ بتاتی ہے کہ میرا شیرو بہت وقت کا پابند ہے۔جو وقت دیتا ہے اس پہ فوراً پہنچ جاتا ہے۔وغیرہ وغیرہ۔۔۔'

'ہاں۔۔۔تو کیا جھوٹ ہے یہ؟' شیرو کی ماں نے کہا۔

'تو بغیر بتائے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' نائلہ نے کہا۔

'مگر میں نے اُس کو واپس جاتے ہوئے دیکھا۔بس میں چڑھ رہا تھا۔ میں نے آوازیں بھی دیں۔ اس نے سنی ان سنی کر دیں۔اور میں بس کے پیچھے بھاگا بھی۔' فیکے نے کہا۔

'ایسا کر اُٹھ۔۔۔جا۔۔۔ٹھنڈے پانی سے نہا۔۔۔ بلکہ میرے ٹیوب ویل پہ جا اور سلیم ہوگا اس کو کہنا۔بی بی نے کہا ہے کہ ٹیوب ویل چلا دے اور اس میں ڈبکیاں لے آ۔۔۔دماغ ٹھنڈا کر۔۔۔پاگل۔۔۔' شیرو کی ماں نے کہا۔

'اچھا خالہ۔۔۔تُو ناراض ہی ہوگئی ہے۔ میں چلتا ہوں۔۔۔کوئی اور ہی ہو گا۔۔۔' فیکے نے کہا۔

'ہمارے ہاں میرا شیرو فون بھی لگوانے والا ہے۔جیسے ہی لگتا ہے میں شیرو کو فون کروں گی۔ پوچھ لوں گی۔ جا شاباش۔۔۔ یا رُک چائے پیئے گا؟؟' شیرو کی ماں نے کہا۔

'نہیں خالہ۔۔۔بہت شکریہ' فیکے نے جواب دیا اور چلا گیا۔

....

لاہور

'کل تم نے کلاس نہیں اٹینڈ کی ہمشراز؟' نازلی نے پوچھا۔

'ہاں۔۔۔گھر گیا ہوا تھا۔ہمشر از نے جواب دیا۔

'خیریت سے گئے تھے؟' نازلی نے پُوچھا۔

'ہاں۔۔۔بس ویسے ہی۔۔۔ہمشر از نے جواب دیا۔

وہ دونوں کاریڈور میں کھڑے تھے۔کلاس لینے کے بعد نازلی کاریڈور میں اس کا ویٹ کرنے لگی۔جیسے ہی وہ گزرا، نازلی نے اُسے روک لیا۔

'چائے پینے چلیں؟؟' نازلی نے کہا۔

'اتنے حیران کیوں ہوئے ہو؟ چائے ہی تو ہے۔کبھی دیکھی نہیں ، کبھی سُنی نہیں۔۔۔یا کبھی پی نہیں؟؟'۔نازلی نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

'دیکھی بھی ہے، سُنی بھی ہے، پیتا بھی ہوں۔۔۔پر۔۔۔تمہارے ساتھ کبھی نہیں پی، دوسرا۔۔۔تُمہیں کبھی چائے پیتے نہیں دیکھا۔ہمشر از نے کہا۔

نازلی ہنسنے لگی۔۔۔'اچھا تو آج پی بھی لینا اور پیتے ہوئے دیکھ بھی لینا' نازلی نے کہا۔

'اچھا چلو۔۔۔کہاں چلوگی؟ہمشر از نے کہا۔

'ہر قسم کی چائے سے کیا مُراد ہے؟' نازلی نے پُوچھا۔

'میں زیادہ غور کر کے نہیں پیتا۔ویسے مُجھے گرم دودھ زیادہ پسند ہے۔ہمشر از نے کہا۔

'مطلب چائے شائے نہیں پیتے۔؟' نازلی نے پُوچھا۔

'سردائی بہت پسند ہے مُجھے ،اور لَسی بھی۔۔۔ہمشر از نے کہا۔

'میں نے کبھی سردائی نہیں پی، لَسی ایک بار نانو نے پلائی تھی۔' نازلی نے کہا۔

'کہاں بیٹھیں؟؟۔۔۔ ہم م م م۔۔۔ وہ درخت کے نیچے بیٹھتے ہیں۔

مشر از نے کہا۔

'ویسے مُجھے حیرت ہے کہ تُم نے کبھی لَسی، سردائی نہیں پی۔۔۔' مشر از نے کہا۔

'ہاں واقعی۔۔۔ کبھی نہیں پی۔ بس ایک بار وہ نانو نے جب پلائی۔' نازلی نے کہا۔

'تو چلو آج تمہیں پیڑے والی لَسی پلاتے ہیں۔' مشر از نے کہا۔

'واقعی۔؟' نازلی نے مُسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

'ہاں۔۔۔ اُٹھو۔۔۔ ایسے کرتے ہیں باقیوں کو بھی بُلا لیتے ہیں۔ شمائلہ، راحیلہ وغیرہ سب کو بُلا لو۔۔۔ میں جاوید لوگوں کو بُلاتا ہوں۔' مشر از نے کہا۔

'وہ نہیں آئیں گی۔ کبھی بھی نہیں۔ جانتے تو ہو انہیں۔' نازلی نے کہا۔

'ہاں یہ بھی ہے۔ چلو آج پھر تُمہیں ہی لے چلتے ہیں۔' مشر از نے کہا۔

دونوں پیدل چلتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ مشر از نے ہاتھ کا اشارہ دیتے ہوئے ایک رکشہ روکا۔

'بھائی۔۔۔ زرا طارے کی لَسی تک لے چلو۔ قریب ہی ہے زیادہ دُور نہیں ہے۔' مشر از نے کہا۔

'آؤ بیٹھو باؤ جی۔' رکشے والے نے کہا۔

'بیٹھو پلیز۔۔۔' مشر از نے نازلی سے کہا۔

وہ دونوں رکشے میں بیٹھ گئے۔

'کتنی بار آ چکے ہو یہاں؟' نازلی نے مشر از سے پُوچھا۔

'ہر اتوار پُورا ہاسٹل اکٹھا ہو کر جاتا ہے۔ لَسی پیتے ہیں اور واپس ہاسٹل آ کر

سوجاتے ہیں۔ ہمشر از نے کہا۔

'بھائی بس یہ دائیں طرف روک دو۔ ہمشر از نے رکشے والے کو کہا۔

وہ پہلے خود اُترا، پھر نازلی کو اُترنے کا کہا۔

'یہ لو بھائی۔ رکھ لو۔۔۔ تم بھی لسی پینا آج۔۔۔ ہمشر از نے رکشے والے کو کہا۔

'بہت شکریہ جناب۔۔۔ اللہ بہت دے۔' رکشے والے نے کہا۔

'تم نے سارے پیسے اُسے دے دیئے؟'۔ نازلی نے پُوچھا۔

'ہاں۔۔۔ میں نے سوچا لسی پی لے گا۔۔۔ ہمشر از نے ہنستے ہوئے کہا۔

'اور لسی پی کے سو گیا ناں۔۔۔ تو باقی کی دیہاڑی بھی جائے گی بیچارے کی۔' نازلی نے کہا۔

وہ دونوں ہنسنے لگے۔

'گلو۔۔۔ ہمشر از نے لڑکے کو آواز دی۔

'جی سرکار۔۔۔ پیڑے والی لسی۔۔۔ آپ کے لئے دو پیڑے اور میڈم کے لئے۔۔۔؟' گلو نے پُوچھا۔

'یار کوئی سلام دُعا تو لینے دے۔۔۔ تُو نے آرڈر بھی سوچ لیا۔ ہمشر از نے ہنستے ہوئے کہا۔

'پہلے حال چال سُنا دے۔۔۔ میڈم تو پہلی بار آئی ہیں۔ ہمشر از نے گلو کو پاس بلاتے ہوئے کہا۔

'کیا حال چال سُناؤں صاحب۔۔۔' گلو کرسی کھینچ کے پاس بیٹھ گیا۔

'میڈم جی۔۔۔ I am Gullo from saheewal' گلو نے کہا۔

'بہت خوشی ہوئی گلو تُم سے مِل کے۔۔۔' نازلی نے کہا۔

'میں پڑھتا تھا سرکاری سکول میں۔۔۔ دوسری جماعت میں چھوڑ دیا۔۔۔

سکول جاتا تو استاد کھال اُدھیڑ دیتا۔۔۔ نہ جاتا تو ابا۔۔۔ کیا کرتا۔۔۔ مصیبت کا مارا گھر چھوڑ آیا ہوں۔۔۔ یہاں اس دکان پر کام کرتا ہوں۔ اور مشکل سے گزر بسر کرتا ہوں۔۔۔' گلو نے گلے میں ڈالے لال رومال کو سیٹ کرتے ہوئے کہا۔

'ایک لسی دو پیڑوں والی اور ایک۔۔۔ ایک پیڑے والی۔۔۔' گلو نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

'نہیں میں بھی دو پیڑوں والی پیئوں گی۔' نازلی نے کہا۔

'ایسا کرمیڈم کی بھی دو پیڑوں والی لے آ۔' مشراز نے ہنستے ہوئے کہا۔

'اوکے سرکار۔۔۔' سیٹی بجاتا ہوا گلو اُٹھ گیا۔

'بہت مزے کا کردار ہے یہ۔ ایک دِن کہتا کہ بھائی۔۔۔ دو تین گلاس لَسی پی جاؤ۔۔۔ خوب پیڑے ڈلوا کے۔۔۔ بھنگ کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔' مشراز نے کہا۔

'اس اتنے سے کو معلوم ہے کہ بھنگ کیا ہوتی ہے؟؟' نازلی نے حیرانی سے پُوچھا۔

'ہاں کیوں نہیں۔۔۔ سب معلوم ہے۔۔ بہت تیز ہے یہ۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'یہ لیجئے جناب۔۔۔ پیڑوں والی مزیدار لَسی۔۔۔' گلو نے لسی کے گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

'یہ لو۔۔۔' مشراز نے ایک گلاس نازلی کو تھماتے ہوئے کہا۔

'کوئی قصہ سُنا دو ہیرو۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'کوئی عشق و محبت کی کہانی سننا چاہ رہے ہو بھائی؟' گلو نے کہا۔

'اوہ خدایا۔۔۔ عشق و محبت۔۔۔!' وہ ہنسنے لگی۔

مشراز نے آج پہلی بار اس کو غور سے دیکھا۔ وہ ہنس رہی تھی۔ اس کو لگا کہ ہاں وہ بھی زندگی سے بھرپور ہے۔ وہ عام لڑکیوں سے مختلف ہے۔ حسین تو سب ہوتی ہیں مگر شائد

دلکش کوئی کوئی ہوتا ہے۔وہ حسین بھی تھی اوراس میں وہ کشش بھی تھی جو کسی بھی مرد کو اپنی طرف متوجہ کرسکتی تھی۔وہ لگا تار ہنس رہی تھی اور مشراز اس پر نظریں جمائے اسے دیکھ رہا تھا۔گلو کو غصہ آرہا تھا۔

’آپ لسی پی چکی ہیں تو اُٹھیں پھر؟؟‘مشراز نے کہا۔

’نہیں۔ابھی تو آدھا گلاس بھی نہیں ہوا۔۔‘نازلی نے کہا۔

’چلو پی لو آرام سے۔۔۔‘مشراز نے کہا۔

’نہیں میری بس ہوگئی ہے۔‘نازلی نے کہا۔

’لو جناب۔۔۔تبھی آپ کے لئے ایک پیڑے والی لسی منگوا رہا تھا۔مگر آپ ہیں کہ۔۔۔‘مشراز نے کہا۔

’خود تُم نے دو پیڑے والی منگوائی ناں۔۔۔ مجھے لگا پتہ نہیں کیسی ہوگی۔۔۔‘ نازلی ہنسنے لگی۔

’کمال ہو تُم بھی نازلی۔۔۔‘مشراز نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

آج اُس نے پہلی بار اس کا نام اس انداز میں لیا تھا۔وہ مشراز کی طرف دیکھ کر مُسکرانے لگی۔

’کیا ہوا؟‘مشراز نے پُوچھا۔

’کچھ نہیں۔‘نازلی نے جواب دیا۔

’چلیں اب؟؟‘مشراز نے کہا۔

’ضرور۔۔۔‘نازلی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

’چلو۔۔۔‘مشراز نے ہاتھ کے اشارے سے نازلی کو آگے چلنے کو کہا۔

’نہیں۔۔۔After You‘وہ مُسکرا کر کہنے لگی۔

....

گورنمنٹ کالج لاہور

'ہاں جی نوجوانو!!۔۔۔ میری قوم کے معماروں۔۔۔' پروفیسر سلمان نے یہ کہہ کر قہقہہ لگایا۔ کلاس بھی ہنسنے لگی۔

'آپ لوگ کیوں ہنسے۔؟ کیا آپ قوم کے معمار نہیں؟؟ پروفیسر سلمان نے نہایت شفیق انداز میں پُوچھا۔

نازلی نے جواب دینے کی غرض سے ہاتھ اُٹھایا۔۔۔

'جی پلیز بیٹا۔۔۔' پروفیسر سلمان نے ہاتھ کے اشارے سے بولنے کو کہا۔

'Definitely Sir.. we are!!' نازلی نے بھرپور اعتماد سے جواب دیا۔

'So , what do you think what should be our priorities as a builder of naiton ?'

پروفیسر سلمان مُسکرانے لگے۔

'سراس کو ایسے کرلیں کہ What should be your priorities' جاوید نے ہنستے ہوئے کہا۔

'اب تو ہماری باری ہے سر۔۔۔' جاوید نے کہا۔

'Very right and very Clever...، جواب بھی آپ ہی سے شروع کرتے ہیں۔۔۔' پروفیسر سلمان نے اپنے گول شیشوں والی عینک آنکھوں پر لگاتے ہوئے، اٹینڈینس شیٹ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

'آج بہت کم لوگ نہیں ہیں؟' پروفیسر سلمان نے سوال کیا۔

'جی سر کل اور پرسوں چھٹی ہے ناں تو کچھ نے آج بھی کر لی تا کہ گھر سے ہو آئیں۔' وقار نے جواب دیا۔

'برخوردار کمال کرتے ہیں آپ لوگ۔۔۔دو چھٹیاں کیا نا کافی تھیں؟' پروفیسر سلمان نے کہا۔

'بہر حال۔۔۔ جی مسٹر جاوید۔۔۔ جواب دیں گے کیا؟' پروفیسر سلمان نے پوچھا۔

'سر آپ حکم دیں کہ جاوید جواب دو۔۔۔' جاوید ہنسنے لگا۔

'نہیں آپ میری درخواست پر ہی غور کر لیجیے، میں برا نہیں مناؤں گا۔' پروفیسر سلمان نے گلاسز ٹیبل پر رکھیں اور اپنی مخصوص مُسکراہٹ دیتے ہوئے کہا۔

'سر۔۔۔جارج برناڈ شا نے ایک بار کہا تھا کہ تبدیلی کے بغیر ترقی ممکن نہیں، اور جو اپنا ذہن یا اپنی سوچ تبدیل نہیں کر سکتے۔۔۔وہ کچھ بھی تبدیل نہیں کر سکتے۔یعنی سر ہماری Priorities کی بات کی جائے تو سوچ میں بہتری لانی ہوگی۔ہماری سوچ میں تبدیلی ہماری پہلی اور آخری Priority ہوگی۔نہ اس سے پہلے کچھ نہ اس کے بعد کچھ۔ کیونکہ سوچ بدل گئی تو معاشرہ بھی بدل گیا، سسٹم بھی بدل گیا حالات بھی بدل گئے۔' جاوید نے کہا۔

'Well done جاوید۔بہت خوب۔'

'سر وہ کہتے ہیں ناں تسبیح پھڑی پر دِل نہ پھریا۔۔۔کی لینا تسبیح پھڑ ھ کے ہوُ۔۔۔' ہمشراز نے کہا۔

'میرے والی بات ہی ہے۔کہ خالی act سے کچھ نہیں ہوگا۔ we have to start from the scratch۔۔۔میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔۔۔' جاوید نے کہا۔

'جاوید صاحب آپ تھوڑا جذباتی ہو رہے ہیں۔بالکل جناب آئیڈیا آپ ہی کا ہے۔بس آپ کے تخیل میں ایک مصرعے کا اضافہ کر کے میں نے آپ کے حسین خیال کو اور حسین کیا ہے۔' ہمشراز نے ہنستے ہوئے کہا۔

پُوری کلاس میں ایک قہقہہ گونجا۔

'بہترین۔۔۔ بہت بہترین۔۔۔' پروفیسر سلمان نے کہا۔

'یہ بات میں نے آپ سب سے اِسی لئے کی۔ بلکہ آغاز یہاں سے اس لئے کیا کہ میں جاننا چاہتا تھا آپ کیا سوچتے ہیں۔ ہمارا آج کا لیکچر بھی اسی حوالے سے ہے۔ میرے پڑھانے کے طریقے سے آپ لوگ بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔ میں پہلے سٹوڈنٹس کا ذہن پڑھنا چاہتا ہوں، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کیا سوچتے ہیں پھر اس کے بعد میں بتاتا ہوں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ آپ کی سوچ میں، میری سوچ میں اور کتابی سوچ میں کیا فرق ہے۔ ہم کہاں غلط اور کہاں صحیح ہیں۔' پروفیسر سلمان نے ڈائس سنبھالتے ہوئے کہا۔

Yes , thats why we admire you - not only as a teacher but '

as a human being too.' نازلی نے چیونگم چباتے ہوئے کہا۔

وہ بلیک کلر کی شرٹ اور پلین بلیک ٹراوئزر پہنے فرنٹ رو میں پہلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ ڈائری سامنے کھلی پڑی تھی۔ کہیں اپنا نام درج تھا تو کہیں نہ پڑھا جانے والا کوئی اور نام۔ کہیں دستخط تھے تو کہیں بے مقصد لکیریں۔ مگر ان کا بھی کوئی مقصد تھا۔ کیونکہ کوئی بھی شے بے مقصد exist نہیں کرتی۔ ایک نقطہ کا بھی کوئی مقصد ہوتا ہے۔ بظاہر تو بہت چھوٹا سا، بہت کم جگہ گھیرنے والا۔ بے معنی سادِکھائی دیتا ہے۔ مگر غلط موقع پر غلط جگہ پر لگ جائے تو سارا موضوع تحریر بدل جاتا ہے۔

'اللہ کا کرم ہے بیٹا۔۔۔ میں یہاں پر ہوں۔۔۔ میرا کچھ بھی نہیں ہے، میرا ایک ایک انداز ایک ایک لفظ اللہ کی دین ہے۔ بہت شکریہ' پروفیسر سلمان نے کہا۔

'خیر آج کے لیکچر کا باقاعدہ آغاز کرتے ہیں۔' پروفیسر سلمان نے کہا اور لیکچر دینے میں مصروف ہو گئے۔

نازلی ان بے مقصد لکیروں کو دیکھنے لگی۔کبھی پروفیسر سلمان کی کسی بات پر دھیان جاتا تو لکھ لیتی ورنہ اپنی ہی سوچ میں مگن، کب گھنٹی بجی اور کب کلاس ختم ہوئی معلوم ہی نہ ہوا۔جب ہوش کی دُنیا میں واپس آئی تو عجیب سا شور تھا جو عموماً کلاسز میں ٹیچرز کے جانے کے بعد ہوتا ہے۔

'نازلی۔۔۔جانا نہیں ہے؟' فاطمہ نے پُوچھا۔

'نہیں تُم لوگ پلیز جاؤ۔۔۔میں ویسے بھی گھر کے لئے نکلنے لگی ہوں۔' نازلی نے کہا۔

'کچھ کھا کے جانا۔۔۔' صائقہ نے کہا۔

....

نازلی ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔بیگ سائڈ پر پڑا تھا، ڈائری کُھلی پڑی تھی۔بالوں کا جوڑا بنائے وہ ہاتھوں سے گھٹنوں کو سمیٹے ہوئے تھی۔

'جناب۔۔۔!!خیر ہو۔۔۔اکیلی کیوں بیٹھی ہیں؟' جانی پہچانی آواز آئی۔

'بس دِل کرر ہا تھا سو بیٹھ گئی۔' نازلی نے کہا۔

'تُم نے بھی گھر جانا ہے؟' مشر از نے پوچھا۔

'نہیں۔۔۔میں لمبی چھٹی پہ جاتی ہوں بس۔۔۔' نازلی نے جواب دیا۔

'کچھ کھانا پینا نہیں ہے ہے؟' مشر از نے پُوچھا۔

'نہیں موڈ نہیں ہے۔' نازلی نے کہا۔'ہم م م۔۔۔موڈ نہ ہونے کی وجہ؟' مشر از نے پوچھا۔

'پتہ نہیں۔۔۔' نازلی نے کہا۔

'لَسی پینے چلیں؟' مشر از ہنسنے لگا۔

'بہت پسند آ گئی ہے لَسی؟' نازلی نے پُوچھا۔

'میں تو پی ہی لیتا ہوں۔ تُمھیں فرصت نہیں ملتی۔' مشرّ از نے کہا۔

'چلو آؤ۔۔۔' نازلی نے کہا۔

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

نازلی نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ 'اُٹھاؤ مُجھے۔۔۔'

اس نے نازلی کو ہاتھ سے سہارا دیتے ہوئے اُٹھایا۔

'یہ نوبت آ گئی ہے کہ آپ خود اُٹھ بھی نہیں سکتیں۔' مشرّ از نے کہا۔

نازلی ہنسنے لگی۔

'نوبت کا تو معلوم نہیں۔ سہارے کی ضرورت تھی تو بتا دیا۔' نازلی نے جواب دیا۔

'اچھا ہے۔' مشرّ از نے کہا۔

'گلو ہوگا آج؟' نازلی نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

'ہاں۔۔۔ وہی ہوگا اُس نے کہاں جانا ہے۔' مشرّ از نے کہا۔

'باقی قصہ آج مکمل کر لیں گے۔' نازلی ہنسنے لگی۔

'ہاں مگر اُسے تنگ نہ کرنا۔ ہیرو خود کو بہت کچھ سمجھتا ہے۔ برا مناتا ہے کوئی اس کا مذاق اُڑائے تو۔' مشرّ از نے کہا۔

'لو جناب ہم پہنچ بھی گئے۔ بھائی بس بائیں ہاتھ پہ روک دو۔' مشرّ از نے کہا۔

'یہ پیسے۔۔۔ تُم بھی لسی پیا کرو۔۔۔' مشرّ از نے رکشے والے کو پیسے دیتے ہوئے کہا۔

'یہ تُم ہر بار رکشے والے کو کیوں پیسے دیتے ہو؟؟' نازلی نے پُوچھا۔

'بھئی۔۔۔ کہیں پڑھا تھا کسی نے کہا ہے کہ اپنا کھایا پیا حلال کیا کرو۔۔۔ مطلب خود کھاؤ تو کسی ملازم وغیرہ کو بھی پیسے دے دو۔ اس طرح تمہارا کھایا پیا حلال رہے

گا۔مشر از نے کہا۔

'ہاں تو اس کو کہا کرو کہ کچھ اور کھائے۔لسی پینے کو نہ کہا کرو۔۔۔' نازلی نے کہا۔

'آج اوپر والے ہال میں بیٹھتے ہیں۔مشر از نے کہا اور سیڑھیاں چلنے لگا۔

نازلی خاموشی سے اس کا تعاقب کرتی ہوئی سیڑھیاں چڑھتی رہی۔

'کہاں بیٹھنا ہے؟' اس نے رُک کر پُوچھا۔

'جہاں کہو۔' نازلی نے جواب دیا۔

'یہاں؟؟' مشر از نے دائیں جانب موجود ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

پوچھا۔

'ہاں' No issues اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

'گلو۔۔۔گلو۔۔۔' نازلی نے گلو کو آواز دی۔

'آیا میڈم۔۔۔' گلو نے جواب دیا۔

گلو کسی ہیرو کی طرح بھاگتا ہوا آیا۔سر پہ پہنی اُلٹی ٹوپی پہ اس نے چشمہ لگایا ہوا تھا۔وہ سر پہ ٹکانے لگا۔گلے میں بندھے رومال کو ڈھیلا کیا اور پھر کہا۔

'یس پلیز۔۔۔'

'او خدایا اتنے دِنوں میں اتنا بدلاؤ۔' نازلی ہنسنے لگی۔

'بھائی میڈم کو بولو آرڈر کریں بس۔' گلو نے کہا۔

'ابھی بھی ناراض ہو؟' نازلی نے پُوچھا۔

'بھائی۔۔۔میڈم کو بولو پلیز۔۔۔' گلو نے کہا۔

'اہوو۔۔۔Emotional۔۔۔' نازلی نے ایک قہقہہ لگایا۔

گلو مشر از کی طرف دیکھنے لگا۔

'یار اصل میں میڈم کو ہنسنے کی بیماری ہے۔اس کی ہنسی کا بُرا نہ مانا کرو۔ڈاکٹر نے

کہا ہے کہ علاج نہیں ہوسکتا۔ جب یہ ہنسے تو ساتھ ہی ہنسنا شروع کر دو۔ دِن تھوڑے ہیں بیچاری کے۔'

مشراز نے گلو کے قریب ہوتے ہوئے اس کے کان میں کہا۔گلو کے چہرے کے تاثرات بدلتے رہے۔

'کیا واقعی؟' گلو نے آہستہ سے کہا۔

'ہاں اور اگر کوئی رو کے تو میڈم جو بھی سامنے ہو اُٹھا کے سر پہ دے مارتی ہیں۔'مشراز نے کہا۔

'سچ۔؟' گلو نے پوچھا۔

'ہاں۔۔۔کل ہی ایک بندے کا سر پھاڑ دیا تھا۔اب تم سے کیا چُھپانا۔'مشراز نے کہا۔

'معاملہ خراب ہے،ایسا کرو آرڈر تو دو۔۔۔' گلو نے کہا۔

'بس دو لسی، ڈبل میں۔'مشراز نے کہا اور مُسکرانے لگا۔

'او کے سرکار،میڈم کو سنبھالو۔۔۔میں لسی لایا۔'

'اُف کیا کردار ہے یہ۔'نازلی نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہ ہنسے جارہی تھی اور مشراز ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔اس کی نظریں مشراز سے ٹکرائی تو ایک دم خاموشی ہوگئی اور پُوچھا،

'کیا ہوا؟'

'کچھ نہیں،ہنستی رہو۔اچھی لگتی ہو۔'مشراز نے کہا۔

'ہنستے ہوئے بس؟'اس نے ایک قہقہہ لگایا اور سوال کیا۔

'یہ لیجیے لسی۔۔۔' گلو نے اپنی دھماکے دار انٹری دیتے ہوئے کہا۔

....

گوکھوال (فیصل آباد)

بابا چراغ دین، سبز چوغا پہنے، گلے میں مالائیں ڈالے ہاتھ میں ڈنڈا اُٹھائے، حق حق کی صداؤں میں مصروف تھا۔ مزار آج پہلے سے زیادہ روشن تھا۔ ہر طرف دیئے جل رہے تھے۔ اگربتیوں کی خوشبو سے فضا مہک رہی تھی۔ سب باری باری آتے اور مزار پر حاضری دے کر کچھ دیر وہیں نیاز کی تقسیم کے لئے رُک جاتے تو کچھ نیاز لے کر چلے جاتے۔ بابا چراغ دین ہر چیز سے بے فکر اپنے میں مست تھا۔ سب انتظار میں تھے کہ کب بابا بیٹھے تو اس سے دعا لیں اور چلے جائیں۔ فیکا، بھولا، جلیل اور امین بھی گاؤں کے باقی لڑکوں کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ کوئی بابا کی عقیدت میں وہاں جاتا تو کوئی وہاں حاضری دینے والیوں کی عقیدت میں دربار کے باہر دندناتے پھرتے۔

'یار شیرو کا کوئی اتا پتا۔ چار ماہ ہو گئے ہیں اس کو شہر گئے ہوئے۔ ابھی تک نہیں آیا' جلیل نے کہا۔

'کیا پتا یار اگلے ماہ آجائے۔ اب تو سردی بھی خوب پڑ رہی ہے۔ اب کی بار تو محفل ڈیوڑھیوں میں سجائیں گے۔' رفیق نے کہا۔

'تو بے فکر رہ ہم تیرا بندوبست کر دیں گے۔' بھولے نے رفیق سے کہا۔

'یار وہ ہیر نے بھی آج دیا جلانے آنا تھا' رفیق نے کہا۔

'تجھے کس نے کہا؟' جلیل نے پوچھا۔

'وہ اس کا خط آیا تھا کہہ رہی تھی بابا فقیرے کی درگاہ پر دیا جلاؤں گی۔' رفیق نے کہا۔

'تو پھر؟ تجھے تو خوش ہونا چاہئے کہ تجھے دیئے نہیں جلانے پڑ رہے۔' تینوں نے ایک قہقہہ لگایا۔

'یار وہ ہیر کی سہیلی کمال ہے۔تو یہ نہ ہوا دھر وہ دیا جلائے، ادھر اس کی مراد پوری ہو جائے۔۔۔'رفیق نے کہا۔

'لو جناب۔۔۔ او یار۔۔۔ بھائی۔۔۔تو ناں۔۔۔۔'جلیل کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ بھولے نے کہا۔

'وہ دیکھو، ایسا لگ رہا کہ اپنا شیرو ہے وہ، بابا چراغ دین کے پاس وہ دیکھو۔۔۔۔'بھولے نے کہا اور تینوں درگاہ کے قریب چلے گئے۔قریب جا کر دیکھا تو واقعی شیرو تھا۔

'ابے یار شیرو آیا اور بتایا بھی نہیں'۔جلیل نے کہا۔

'یہیں انتظار کرتے ہیں۔۔۔'رفیق نے کہا۔

'پٹوائے گا کیا۔انتظار کریں وہ بھی یہاں کھڑے ہو کر اور وہ بھی تیرے ساتھ۔ ادھر ہی چلتے ہیں کھیتوں کی طرف۔'جلیل نے کہا۔

'میں تو اس لئے کہہ رہا ہوں کہ شیرو ملے بغیر نہ چلا جائے۔'رفیق نے کہا۔

'ایسا نہیں ہو سکتا۔'جلیل نے کہا۔

'مجھے یقین ہے وہ پچھلی بار بھی شیرو ہی تھا تم سب نے نہیں مانا۔'رفیق نے کہا۔

'ہاں یار مُجھے لگتا ہے کہ ٹھیک کہہ رہا ہے فیکا۔شیرو ہی ہو گا۔انتظار کر لیتے ہیں مگر پیچھے ہو کے، کیوں جلیل؟؟'بھولے نے کہا۔

'ہاں ٹھیک ہے۔'جلیل نے کہا اور تینوں اڈے پہ جا کر کھڑے ہو گئے۔

'اگر تو وہ شیرو ہے تو چاہے شہر جائے یا گھر جائے اسی رستے سے مل لیں گے۔

....

'آ گیا۔۔۔ مجھے معلوم تھا کہ آئے گا۔'بابا چراغ دین ہنسا۔

'بیٹھا رہ۔۔۔کیا مُراد ہے ویسے؟'بابا چراغ دین نے کہا۔

'کوئی مُراد نہیں بابا۔۔۔ویسے ہی آپ کو ملنے حاضر ہوا۔'مشر از نے کہا۔

'مُجھ سے؟؟' بابا چراغ دین نے ایک اور قہقہہ لگایا اور پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ پھر سے گھومنے لگا۔اب کی بار وہ کنویں کے گرد چکر لگا رہا تھا، پھر درخت کے نیچے کھڑا ہو کر گھومتا گیا۔ڈنڈا فضا میں بلند کئے ہوئے وہ پیروں میں پہنے کڑوں کی آواز سُنتا رہا۔جب تھک گیا تو اپنی مخصوص جگہ پر جا کی بیٹھ گیا۔سر زمین پر جھکائے ہوئے وہ کئی گھنٹوں وہاں پڑا رہا۔مشراز کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا مگر پھر اُٹھ کر گھر کی جانب چل دیا۔

اندھیرا ہو چُکا تھا۔سردی بھی دھیرے دھیرے زور پکڑ رہی تھی۔مشراز چادر لپیٹے گھر کی جانب بڑھا پھر کچھ دیر چوک میں موجود دکانوں کے باہر بچھی چار پائی پر بیٹھ گیا۔چار پائی کے ساتھ بالٹی میں کچھ کوئلے سُلگ رہے تھے جیسے ابھی ابھی کوئی اُٹھ کے گیا ہو۔وہ ماحول سازگار پا کر وہیں بیٹھ گیا۔آج وہ اس سوچ میں مگن تھا کہ آخر وہ بابا چراغ دین میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔وہ خود پہ مُسکرایا۔اس کا دِل چاہا کسی دوست سے اس حوالے سے بات کی جائے۔اس کے ذہن میں پہلا خیال مہرو کا آیا۔'ہاں! وہ اچھا تجزیہ کر سکتی ہیں۔تو پھر صبح ہی سرگودھا کا رُخ کرتا ہوں۔مگر ایک دِن میں اماں۔۔۔ہم م م م چلو کچھ کرتا ہوں۔'

وہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ وہاں بیٹھا رہا۔پھر دوبارہ بابا چراغ دین کی طرف چل نکلا۔

درگاہ میں قدم رکھتے ہی بابا چراغ دین نے آواز لگائی۔'آ گئے ہو؟۔۔۔ آؤ۔۔۔تمہارا ہی انتظار تھا۔'

'جی حکم بابا جی۔'مشر از نے کہا۔

'ڈھونڈ رہا تھا بھرے میلے میں تمہیں۔پھر خیال آیا کہ جا چکے ہو گے۔'بابا چراغ دین نے کہا۔

'جی چلا گیا تھا۔'مشراز نے کہا۔

آج بابا چراغ دین پہلے کی نسبت مختلف لگ رہا تھا۔ آج وہ عام انسانوں سا لگ رہا تھا۔ اندازِ گفتگو، باتیں، لہجہ سب عام سا، نکھرا ہوا۔۔۔

'کیا سوچ رہے ہو برخوردار؟' چراغ دین نے پوچھا۔

'میں سوچ رہا تھا کہ آج آپ بدلے بدلے سے لگ رہے ہیں۔ بالکل عام انداز، عام گفتگو آج عام انسان لگ رہے ہیں۔' مشراز نے بلا جھجک کہا۔

بابا چراغ دین ہنسا۔

'ہاں۔۔۔ آندھی چلتی ہے، بارش ہوتی ہے۔۔۔ اس کے بعد کبھی آسمان دیکھا ہے؟؟ نکھرا نکھرا نیا نیا، پُرسکون سا۔۔۔ بس یہی سمجھ لو۔ جب رقص کرتا ہوں، دھمال ڈالتا ہوں، مست ہو جاتا ہوں۔ لگتا ہے دِل کا سارا غبار سارا میل باہر نکل رہا ہے۔ جب بس کرتا ہوں تو آرام سے آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتا ہوں۔ پھر خود کو ہلکا محسوس کرتا ہوں۔' بابا چراغ دین نے کہا۔

'بابا۔۔۔ تُم رات کو قبرستان کیا کرنے جاتے ہو؟' مشراز نے پُوچھا۔

'چلہ کاٹنے۔۔۔' بابا نے مُسکرا کر کہا۔

'چلہ؟' مشراز نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

'ہاں۔۔۔' بابا چراغ دین نے کہا اور پھر ایک قہقہہ لگایا۔

'پُتر۔۔۔ قبرستان۔۔۔ پیاروں کو دعا دینے اور پیاروں کی دُعا لینے بھی جاتے ہیں۔' بابا چراغ دین نے کہا۔

'آ جا۔۔۔ پیچھے چلتے ہیں۔۔۔ مُرشد کے قدموں میں۔۔۔' بابا چراغ دین اس کو لے کر پچھلی طرف چلا گیا۔

....

بی بی صاحبہ

'پردہ۔۔۔پردہ۔۔۔۔' حویلی میں آواز گونجی۔

باہر آواز آتے ہی سب مردوں نے منہ پھیر لیا۔خواتین چادروں کے گھونگھٹ لٹکائے باہر کی طرف آنے لگیں۔

'بی بی صاحبہ نے درگاہ تک جانا ہے۔' ایک ملازمہ نے وہاں کھڑے خادم کو کہا۔

'جی۔۔۔سواری تیار ہے۔۔۔' ملازم نے بتایا۔

'بڑے صاحب واپسی کا پوچھ رہے تھے' ملازم نے کہا۔

'بابا جانی کو کہنا شام تک لوٹ آئیں گے۔' بی بی صاحبہ نے کہا۔

'جی سرکار۔۔۔' ملازم نے کہا۔

سفید رنگ کی چادر سر سے لے کر پیروں تک اوڑھے ہوئے وہ مُرشد سرکار کی بیٹی تھی۔جدی پُشتی پیر تھے۔ ہر وقت مُریدوں کا رش پڑا رہتا تھا۔گھر ہو ڈیرہ ہو یا درگاہ۔۔۔ محفلیں سجی رہتی تھیں۔بی بی صاحبہ کا قافلہ درگاہ کی جانب روانہ ہو چُکا تھا۔قافلے کا گزر جہاں جہاں سے ہونا تھا پردے کا انتظام پہلے ہی کرا دیا جاتا تھا۔گو کہ قافلے میں شامل تمام عورتیں پردے میں ہوتیں مگر پھر بھی پیرزادی کا احترام یہ ہوتا کہ گزرگاہوں سے لوگ ہٹا دئے جاتے۔۔۔نگاہیں نیچی کروالی جاتیں۔یہ قافلہ بھی ایسے ہی رواں دواں تھا۔اچانک سواری رُک گئی۔

'سمو۔۔۔ذرا پوچھو تو۔۔۔کیا ہوا ہے؟'۔بی بی صاحبہ نے ملازمہ کو کہا۔

'اتنے میں دلیر بگھی کے پردے میں کھڑا ہوا کر کہنے لگا۔۔۔بی بی صاحبہ، بہت معذرت۔۔۔معلوم نہیں کیا ہوا۔۔نو لکھے کی طبیعیت نا ساز لگ رہی ہے۔اس کے قدم لڑ کھڑا رہے ہے۔تکلیف کے لئے معذرت بی بی صاحبہ،مگر اللہ جانے حویلی سے نکلتے ہوئے

بالکل تندرست تھا۔سواری کا انتظام بھی کرنے گیا ہے لیاقت اور طبیب کا بھی کہہ دیا ہے۔ بس تھوڑا سا انتظار فرما لیجئے۔'

'ٹھیک ہے۔اللہ بہتر کرے گا۔'بی بی صاحبہ نے کہا۔

'تکلیف کے لئے معذرت۔۔۔اگر نیچے سائے میں تشریف لے آئیں۔۔۔' دلیر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

'جی بہتر۔۔۔'بی بی صاحبہ نے کہا اور بگھی سے اُترنے لگی۔ملازمہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔دلیر نے سائے میں درخت کے نیچے دری بچھائی۔بی بی صاحبہ دری پر بیٹھ گئیں۔۔۔

'آؤ۔۔۔رانی۔۔۔بیٹھ جاؤ۔۔۔'بی بی صاحبہ نے رانی کو کہا۔

دلیر رانی کے لئے دوسری چٹائی بچھانے لگا۔رانی چٹائی پر بیٹھ گئی۔

'نو لکھے کو اچانک کیا ہوا؟'۔بی بی صاحبہ نے پوچھا۔

'معلوم نہیں بی بی صاحبہ۔۔۔'رانی نے کہا۔

'شائد کوئی وبا پھوٹی ہوئی ہے۔مجھے لگتا ہے نو لکھا بھی اُسی کی زد میں آ گیا ہے۔کچھ دِن ہوئے اصطبل میں اور بھی گھوڑے اچانک صحت کھونے لگے ہیں۔'رانی نے مزید کہا۔

'اچھا۔۔۔صحیح۔۔۔اللہ صحت دے گا۔۔۔بابا جانی کو علم ہے کیا؟'بی بی صاحبہ نے پُوچھا۔

یہ گفتگو ابھی جاری تھی کہ دُور کہیں سے گھوڑے کی چاپ سنائی دی۔تانگے والا گنگناتا ہوا گھوڑا دوڑا رہا تھا۔آواز سے کوئی سترہ اٹھارہ برس کا لڑکا تھا اور مزاج سے نہایت لاابالی سا معلوم ہوتا تھا۔دلیر نے ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے تانگے والے کو روکا۔

'پردہ ہے صاحب۔۔۔'وہ رُکا تو دلیر نے کہا۔

'پردہ ہے۔۔۔کس کا پردہ؟؟' تانگے والے نے کہا۔

'پردہ ہے تو وہ کریں۔۔۔میرا پردہ تو نہیں۔۔۔'اس نے ہنستے ہوئے کہا اور ایک گردن گھما کر درخت کی طرف دیکھا۔سر سے لے کر پیروں تک سفید چادر لپیٹے وہ لڑکی درخت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔لمبی لمبی پلکیں اس کے گورے چہرے پر بہت واضح ہو رہی تھیں۔ہونٹ چادر کی اوٹ میں کئے وہ ایک ہاتھ سے چادر تھامے بیٹھی تھی۔نگاہ شرم وحیا سے جھکی ہوئی تھی۔اس نے یہی خواہش کی کہ یہ پردہ چھٹ جائے،نگاہیں اُٹھ جائیں تا کہ آنکھیں گہرائی میں جھانک سکیں۔

'برخوردار۔۔۔ یہاں نئے معلوم ہوتے ہو؟؟ پیرزادی ہیں۔۔۔ پاس میں ہی درگاہ کی زیارت کے لئے جانا ہے۔ہمارا گھوڑا بیمار پڑ گیا ہے۔لے چلو۔۔۔اور واپس حویلی تک بھی لے جانا۔جتنا معاوضہ ہوگا اس سے دُگنے دئے جائیں گے۔' دلیر نے سخت لہجے میں کہا۔

تانگے والے نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا'معذرت سرکار۔۔۔ درست فرمایا۔۔۔ ایک ہفتہ پہلے ہی اس گاؤں میں آیا ہوں۔معاوضے کی کوئی فکر نہیں۔آپ آیئے۔' تانگے والے نے نہایت احترام سے کہا۔

بی بی صاحبہ اور ملازمہ تانگے کے پچھلی نشست پر سوار ہو گئے اور دلیر تانگے والے کے ساتھ آگے بیٹھ گیا۔

سفر شروع ہوا۔اسکی نگاہیں آگے راستے ہی پر تھیں مگر دھیان پیچھے تھا۔' کاش یہ پردہ چھٹ جائے۔۔۔۔کاش۔۔۔۔'وہ یہی سوچ رہا تھا۔

'کیا نام ہے تمہارا؟' ۔دلیر نے پوچھا۔

'غلام حیدر۔۔۔'تانگے والے نے جواب دیا۔

'کیا خوبصورت نام ہے۔۔۔ سبحان اللہ۔۔۔اللہ تمہیں کامیابیوں سے

نوازے۔' دلیر نے کہا۔

'درگاہ کا راستہ مجھے صحیح سے معلوم نہیں۔ اگر بُرا نہ منائیں تو رہنمائی کرتے رہئے گا۔' غلام حیدر نے کہا۔

'کیوں نہیں۔' دلیر نے جواب دیا۔

پورا راستہ کوئی اور بات نہ ہوئی۔ درگاہ پر پہنچتے ہی بی بی صاحبہ اور ملازمہ دلیر کی سرپرستی میں اندر داخل ہوئیں۔ غلام حیدر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کیسے دلیر کو دیکھتے ہی لوگ رستا چھوڑتے جاتے ہیں۔ دلیر کے پیچھے چلنے والی خاتون کو دیکھ کر نگاہیں نیچی کر لیتے ہیں۔ غلام حیدر پُورا منصوبہ تیار کئے ہوا تھا کہ کب اور کیسے بی بی صاحبہ پر نگاہ ڈالنی ہے مگر حیا آڑے آ جاتی اور نظریں چاہ کر بھی نہ اُٹھا پاتا۔ بی بی صاحبہ زیارت سے واپس آ رہی تھیں تو غلام حیدر تانگے کی اوٹ میں چُھپ گیا تا کہ نظریں چرا کر ایک بار پھر بی بی صاحبہ کو دیکھ سکے۔ اس کا یہ حربہ کسی حد تک کامیاب ٹھہرا۔ وہ بی بی صاحبہ پر نظریں جمائے کھڑا تھا وہ تانگے کی طرف آ رہی تھیں۔ نظریں جھکائے، چادر سنبھالے۔۔۔ یکا یک ایک بچہ بھاگتا بھاگتا بی بی صاحبہ کے قدموں میں آ گرا۔ وہ بچہ کھیل رہا تھا اور ماں سے زبردستی ہاتھ چُھڑا کر بھاگا تھا۔ بی بی صاحبہ اچانک رُک گئیں اور بچے کو اُٹھانے کے لئے نیچے جھکیں۔ چادر ہونٹوں سے ہٹ چکی تھی۔ چہرہ نمایاں تھا۔ تیکھا ناک، باریک گلابی ہونٹ اور کاجل سے سجی آنکھیں، وہ چُھپ چُھپ کر دیکھ رہا تھا۔ بی بی صاحبہ چادر سنبھالنے لگیں تو اچانک ان کی نظر تانگے کی اوٹ میں چُھپے غلام حیدر پر پڑی۔ غلام حیدر بوکھلا گیا اور جھٹ سے تانگے کی اوٹ سے باہر نکل آیا اور ہاتھ باندھ کر احترام سے کھڑا ہو گیا۔ بی بی صاحبہ اور ملازمہ آ کر تانگے میں سوار ہو گئیں۔ دلیر بھی بیٹھ گیا اور غلام حیدر کو آواز دی۔

'جی سرکار۔۔۔' غلام حیدر فوراً تانگے پر سوار ہو گیا۔

'صاحب راستہ بتاتے رہیے گا۔' غلام حیدر نے کہا۔

'بے فکر رہو۔۔۔' دلیر نے کہا۔

دائیں بائیں دونوں جانب لہلہاتے کھیت تھے۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ پرندے اپنے گھر کو جارہے تھے۔ کسان عورتیں اور مرد دونوں کام ختم کر کے گھر کی راہ پکڑے ہوئے تھے۔ تانگہ جہاں سے بھی گزرتا پہلے دیکھنے والے حیرانی کی ایک نگاہ ڈالتے اور پھر احترام سے نظریں جھکا لیتے۔ غلام حیدر کو بہت حیرت ہوتی۔ بالآخر اُس نے پوچھ ہی لیا۔

'جناب اگر اجازت دیں تو ایک بات پُوچھ لوں؟؟' غلام حیدر نے کہا۔

'جی پوچھیے۔' دلیر نے کہا۔

'یہ تانگہ جہاں سے بھی گزرتا ہے۔ دیکھنے والے پہلے تو سکتے میں آجاتے ہیں اور پھر نگاہیں جھکا لیتے ہیں۔ میرے تانگے کو کب سے اتنی عزت ملنے لگی۔' وہ مُسکرایا۔

دلیر نے ایک سخت نگاہ اس پر ڈالی وہ تھوڑا شرمسار ہوا۔

'سفید چادریں یہاں سیدزادیوں اور پیرزادیوں کی پہچان ہوتی ہے۔ میرے دادا، بابا، میں۔۔۔ ہم سب کئی برسوں سے پیروں کے غلام بھی ہیں اور مُرید بھی، ان کی خدمت کرتے ہوئے پشتیں گزر گئی ہیں۔ یہاں کے لوگ جانتے ہیں کہ کب کس وقت کون گزرتا ہے۔ کس کے لئے نگاہیں جھکانی ہیں اور کس کے لئے اُٹھانی ہیں۔ ہم حویلی کی پالکی میں سوار نہیں ہیں مگر پھر بھی یہاں کے رہائشیوں کو معلوم ہے کہ چھوٹی بی بی ہر جمعرات اس راستے سے درگاہ کی طرف جاتی ہیں۔' دلیر نے جواب دیا۔

'یہاں سے اُلٹے ہاتھ کی طرف جاؤ اور پھر سیدھا حویلی نظر آئے گی۔ اسی پکی سڑک پر چلتے رہنا۔' دلیر نے کہا۔

'سورج غروب ہو چکا تھا۔ تانگہ حویلی کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا تھا۔ دالان کے دائیں جانب راستہ تھا جو اصطبل کی طرف جاتا تھا۔ بائیں جانب پالکیاں کھڑی

تھیں جو حویلی کے اندر تک جانے کا کام کرتی تھیں۔ حدِ نگاہ تک سبزہ ہی سبزہ تھا۔ کچھ دُور جا کر ایک بڑی سی بیٹھک نما جگہ دکھائی دیتی تھی۔ اس کے دائیں جانب یوں معلوم ہوتا تھا کہ حویلی کا اندرونی دروازہ ہے۔ بی بی صاحبہ تانگے سے اُتریں اور پالکی کی جانب بڑھی۔ دلیر، غلام حیدر کو معاوضہ دینے لگا۔ غلام حیدر نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ 'نہ سرکار۔۔۔ آپ شرمندہ نہ کیجئے۔ ہم بھی پیروں کے غلام ہیں، اب اتنا تو کر ہی سکتے ہیں' غلام حیدر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

بی بی صاحبہ پالکی میں سوار ہو گئیں۔ ملازمہ دلیر کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ 'بی بی صاحبہ کا حکم ہے کہ مہمان کی مہمان نوازی کی جائے اور صبح رخصت ہونے کا کہا جائے۔ رات کے وقت دوسرے گاؤں جانا ٹھیک نہیں اور وہ بھی جب رستہ معلوم نہ ہو'

'جی بہتر' دلیر نے کہا۔

'بی بی صاحبہ کا حکم ہے آج رات آپ اس حویلی کے مہمان ہیں۔ میں مہمان خانہ کھلواتا ہوں' دلیر نے کہا اور غلام حیدر کو دوسرے ملازم کے سپرد کر کے چلا گیا۔

....

رسول آباد

'ارے دیکھ تو سہی دروازے پر کون ہے؟' خالہ نے آواز لگائی۔

'خالہ۔۔۔ خالہ۔ وہی شہر والے بابو ہیں۔۔۔' انیس نے بھاگتے ہوئے آکر بتایا۔

'ارے کون۔۔۔؟؟' رانو نے بال سلجھاتے ہوئے کہا۔

'وہ جو بڑے پیارے ہیں۔ وہ لمبے سے۔۔۔ وہ جو پہلے بھی آئے تھے۔ شیراز۔۔۔' انیس نے کہا۔

'ارے۔۔۔مشراز آئے ہیں۔'رانو شرماتے ہوئے کہنے لگی۔'جاؤں ناں اماں دروازے تک تو جاؤ۔۔۔'رانو نے کہا۔

'ارے او کمبخت اس کو دروازے پر کھڑا کر آیا ہے۔وہ کون سا پرایا ہے۔یہاں لے آؤ۔۔۔'خالہ اُٹھی اور دروازے کی طرف لپکی۔

'کمال ہو گیا بیٹے۔۔۔تو یہاں کھڑا ہے۔تو کوئی غیر ہے۔اندر آ جا۔۔۔'خالہ نے دروازہ کھولا اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

'جیتا رہ جُگ جُگ جیئے۔۔۔کل ہی مہرو تیری باتیں کر رہی تھی۔'وہ اندر آتا گیا۔

'السلام علیکم۔۔۔کیسی ہو گڑیا۔۔۔؟'مشراز نے رانو کو آواز دیتے ہوئے کہا۔

'ٹھیک ہوں۔۔۔آپ سنائیں۔۔۔دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے گی لیکن آپ گڑیا کہنا نہیں بھولیں گے۔میں کوئی اتنی چھوٹی نہیں ہوں۔'رانو نے مُنہ بناتے ہوئے کہا۔

'ہاں ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔۔۔ہی ہی ہی۔۔۔'خالہ ہنسنے لگیں۔'جوان ہے میری بچی۔'

'آپ کیسی ہیں؟؟'مشراز نے مہرو سے پوچھتے ہوئے کہا۔

'الحمدللہ مشراز کرم ہے اللہ کا آپ سنائیں۔'مہرو نے کہا۔

'صرف آپ سے ملنے آیا ہوں۔۔۔ڈھیروں باتیں کرنی ہیں۔'مشراز نے کہا۔

'آیا بس ایک دن کے لئے ہوں۔۔۔کل شام نکل جاؤں گا۔۔۔'مشراز نے مزید کہا۔

'سو بار آؤ بیٹا۔۔۔لاکھ بار آؤ۔۔۔'خالہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

'مہرو چائے کا بندوبست کر، جا رانو ہاتھ بٹا مہرو کا۔۔۔'خالہ نے کہا۔

چائے پانی سے فارغ ہو کر مشراز نے کہا، ایسے کرتے ہیں باہر آگ جلا کر بیٹھتے

ہیں۔ کیوں خالہ، کچھ دیر گپ شپ کر لیں گے۔

'اے لو۔۔۔ لڑکے اتنی سردی میں۔۔۔ یہ برآمدے میں بیٹھ جاؤ۔۔۔ تمہارا جوان خون ہے۔ خالہ تو بوڑھی ہے نا۔۔۔ ہی ہی ہی۔۔۔ خالہ ہنسنے لگی۔۔۔۔ چل رانو۔۔۔ برآمدے کی چارپائیاں سیدھی کر۔۔۔' خالہ نے کہا۔

'میں آگ سُلگا دوں بچیوں سے نہیں جلے گی۔ تب تک مہرو کھانا شانا کر لے۔' خالہ نے مشراز سے کہا۔

'خالہ حیدری کیسا ہے؟' مشراز نے ہاتھ آگ سے سینکتے ہوئے کہا۔

'ٹھیک ہے۔ وہ اپنے ابا کے ساتھ اُسی کے شہر چلے گئے ہیں' خالہ نے کہا۔

'کھانا بہت لذیذ تھا۔۔۔ مشراز نے مہرو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

'شکریہ۔۔۔' مہرو نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

'میں نے سلاد بنایا تھا' رانو نے اتراتے ہوئے کہا۔

'سب بنا سکتے ہیں۔۔۔ بڑی ہو جاؤ تو سب سیکھ جاؤ گی۔۔۔' مشراز نے اُسے چڑاتے ہوئے کہا۔

'ہی ہی ہی۔۔۔ بس ہنستے مُسکراتے رہو بچو۔۔۔ میں تو سونے چلی۔۔۔ رات بھی ہو گئی ہے اور ٹھنڈ بھی ہے' خالہ نے کہا اور اندر چلی گئی۔

'تُم سناؤ تمہاری یونیورسٹی کیسی چل رہی ہے؟' مہرو نے پُوچھا۔

'بہت اچھی۔۔۔ بس ایک سمسٹر باقی ہے۔ پھر فارغ۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'چلو اچھا ہے۔ کوئی اچھی سی نوکری دیکھنا پھر۔۔۔' مہرو نے کہا۔

'میرے بال ٹھیک سے باندھ دیں ناں مہرو باجی' رانو نے مہرو سے کہا۔

'ٹھیک تو ہیں۔ انہیں کیا ہوا ہے' مشراز نے کہا۔

'نہیں ٹھیک۔۔۔ یہ دیکھیں۔۔۔ ایسے ہوتے ہیں ٹھیک۔۔۔' رانو نے کہا۔

'وہ نائلہ کیسی ہے اور خالہ بھی؟؟' رانو نے پوچھا۔

'دونوں خیریت سے ہیں۔ بمشر از نے جواب دیا۔

'میرا اسلام کہیے گا۔' رانو نے کہا۔

'تم خود ہی چلی جانا جانا کبھی۔ بمشر از نے کہا۔

'آپ جب لے کے جائیں گے۔۔۔ اب تو تبھی جائیں گے ناں۔' رانو نے کہا۔

'ٹھیک ہے پھر آپ دونوں پلان بنالیں۔ ہم چلے جائیں گے۔ بمشر از نے کہا۔

'میں اس بار بابا چراغ دین سے پھر ملا۔۔۔ بمشر از نے مہرو کو بتایا۔

'اچھا تو کیا جواب دیا بابا نے کہ وہ کیوں قبرستان جاتا ہے۔؟' مہرو نے پوچھا۔

'ہاں۔۔۔ اس نے کہا قبروں پر یا دعا کرنے جاتے ہیں یا دعا لینے جاتے ہیں۔ بمشر از نے کہا۔

'اس سے باتیں کر کے پتہ چلا کہ اُس کا تو دِل بالکل ٹوٹا ہوا ہے۔۔۔ اس ٹوٹے برتن کی طرح۔۔۔ بمشر از نے کہا۔

'ٹوٹے ہوئے دِل کو کبھی کسی شے سے تشبہ نہ دینا۔۔۔ دِل کی تو تشبیہات بنتی ہی نہیں ہیں۔۔۔ اور ٹوٹے دِل کی۔۔۔ بالکل بھی نہیں۔۔۔۔۔۔ کیونکہ جب دِل ٹوٹتا ہے تو وہ اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ جیسے کمہار مٹی کے برتن بنا کر اس کو سکھاتا ہے اور پھر سوکھنے کے بعد اس کو تیز آگ میں پکاتا ہے۔ تکلیف پختگی عطا کرتی ہے۔ دِل کو ٹھیس لگنے کے بعد اس کی مضبوطی کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔'

'یہ تو صحیح کہا آپ نے۔۔۔ سو فیصد۔ لیکن دیکھیں ہر چیز کی تشبیہہ تو بنتی ہے۔ آپ نے بھی تو مثال دے ہی دی۔ بمشر از نے کہا۔

'میں نے دل کی تشبیہہ نہیں دی۔۔۔ میں نے بات کی، کہ پختگی کے لئے سختی سے

گزرنا ضروری ہے۔' مہرو نے کہا۔

'اور پھر آپ نے کہا کہ دل ایسے ہو جاتا ہے کہ جیسے کمہار۔۔۔' مشراز کچھ کہہ رہا تھا۔

'ہاں۔۔۔ بس پھر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ دِل بھی انسان کی طرح unpredictable ہے۔ اور نہ اس کی تشبیہات ممکن ہیں اور نہ ہی مماثلت۔' وہ ہنسنے لگی۔

....

لاہور

'کب آئے تُم؟ بتایا بھی نہیں۔' نازلی نے مشراز کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

'یہ کیسا سوال ہے؟ کب آیا ہوں۔۔۔؟ جب بھی آیا ہوں اب تُمہارے سامنے ہوں۔' مشراز نے کہا۔

'اتنے دِن کیوں غائب رہے؟' نازلی نے پوچھا۔

'تُم سناؤ۔۔۔ کیسا رہا سب؟' مشراز نے پوچھا۔

'کیسا ہو سکتا ہے؟' وہ مُسکرائی۔

'گلو سے ہوئی تھی ملاقات۔ اس نے شاہی کنگھی کا قصہ سُنایا تھا۔' وہ ہنسنے لگے۔

'بہت تیز چیز ہے۔' مشراز کہنے لگا۔

'ہاں۔۔۔ میں تو حیران رہ گئی۔' نازلی نے کہا۔

'ایک بات بتاؤ نازلی۔' مشراز نے کہا۔

'جی پوچھو۔' نازلی نے کہا۔

'تُم پیر فقیر یا درگاہ درباروں پر یقین رکھتی ہو؟' مشراز نے پوچھا۔

'یقین کا کیا مطلب ہے۔ جب کوئی چیز Exist کرتی ہے تو یقیناً اس کی کوئی

حقیقت بھی ہوگی۔اور جس کی کوئی حقیقت ہواس کو ہم مانے یا نہ مانیں۔اس کی ذات پہ کوئی فرق نہیں پڑتا۔' نازلی نے جواب دیا۔

'ہاں بات تو ٹھیک ہے تمہاری۔' مشراز نے کہا۔

'کیوں کیا ہوا؟' نازلی نے پوچھا۔

'کچھ نہیں۔۔۔ہونا کیا تھا۔' وہ مُسکرایا۔

'پھر بھی۔اچانک کہاں سے یہ درگاہ، دین، فقیر یار آ گئے۔' نازلی نے پوچھا۔

'ارے بھائی اچانک نہیں۔میرے گاؤں میں ان درگاہوں، پیر فقیروں پر بہت یقین کیا جاتا ہے۔کسی کو محبت بابا کی دعا سے ملتی ہے تو کسی کو اولاد۔بس آگ آتے ہیں، چراغ جلاتے ہیں، چلے جاتے ہیں۔پھر خوشی خوشی آتے ہیں نیاز چڑھا جاتے ہیں۔' وہ ہنسنے لگا۔

'واقعی، ہر مُراد پُوری ہوتی ہے؟' نازلی نے پُوچھا۔

'ہاں سُنا تو ہے۔' مشراز نے کہا۔

'تُم نے کبھی کچھ نہیں مانگا۔؟' نازلی نے پُوچھا۔

'نہیں۔۔۔ابھی تک تو کچھ نہیں۔' مشراز نے کہا۔

'کون سا گاؤں ہے تُمہارا؟' نازلی نے پوچھا۔

'گوکھووال۔۔۔بابا فقیرے کا مزار ہے۔۔۔یہ بھی سُن لو۔' مشراز ہنسنے لگا۔

اس نے زمین سے توڑی ہوئی گھاس اُٹھا کے مشراز کی طرف پھینکی۔۔۔'میں نے ویسے پُوچھا گاؤں کا۔۔۔نازلی نے کہا۔

'میں نے بھی ویسے بتایا۔بس دیا ساتھ رکھ لینا۔۔۔وہ اپنا ہونا چاہئے۔' مشراز ہنسنے لگا۔

نازلی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی، پھر مسکرائی۔

....

گوکھووال

بابا چراغ دین

'اس دن اس مہمان خانے سے جانے کا ذرا دل نہیں تھا۔ بس پھر ایک ہی ترکیب سُوجھی، اپنا پاؤں زخمی کروالیا۔ مجھے معلوم تھا کہ پاؤں کے اس درد سے اس حال میں مجھے جانے نہیں دیں گے۔ دلیر خان آیا، اُس نے پاؤں زخمی دیکھا تو فوراً طبیب کو بُلا لایا۔ اس نے مرہم پٹی کی۔ خبر بی بی صاحبہ تک پہنچ چکی تھی۔ بی بی صاحبہ نے ایک اور ملازم بھیجا صرف میری دیکھ بھال کے لئے۔ میں جس مہمان خانے میں ٹھہر رہا تھا وہاں سے بی بی صاحبہ کے کمرے کی کھڑکی صاف نظر آتی تھی۔ مگر میری ہمت نہ ہوتی کبھی نظر اُٹھا کے دیکھتا۔ بس جوانی تھی اور جوش تھا جس نے وہاں روک لیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ جوش کس موڑ پر لے نہ چاہتے ہوئے آئے گا۔ میں نہ چاہتا ہوئے بھی وہ کھڑکی کھلنے کا انتظار کرتا رہتا۔۔ معلوم تھا کبھی نہیں کُھلے گی۔ پیروں کے دَر کے طور ہی اور ہوتے ہیں۔ ان کی کھڑکیاں کہاں کھلتی ہیں۔ ان کے تو دروازے کھلتے ہیں جو کبھی بند ہی نہیں ہوتے۔ بہت خیرات ملتی ہے مگر محبت کوئی خیرات تو نہیں۔ آہ۔۔۔ محبت واقعی کوئی خیرات تو نہیں۔ دینے والا خیرات سمجھ کر دیتا ہے نہ لینے والا ایسی بھیک لیتا ہے۔ وہ محبت ہی کیا جو خیرات میں مل جائے۔ محبت تو عنایت ہے۔ محبت تو تحفہ ہے۔ خدا کا بھی اور محبوب کا بھی۔

میرے پاؤں کا زخم خراب ہوگیا۔ بگڑتا گیا۔ لاکھ علاج کے باوجود کچھ نہ بنا۔ بڑے مرہم لگائے۔ میں وہیں اسی در پڑا رہا۔ مہینہ ہوگیا۔ پاؤں کا زخم تو الگ، دل کا عارضہ زور پکڑ گیا۔ ایک مہینہ دس دن میں کوئی چھ سات بار بی بی صاحبہ کو سامنے سے گزرتا ہوا پایا۔ پہلے بی بی جی صرف جمعرات کو جاتی تھیں، پھر جمعہ کو بھی جانا شروع ہوگئیں۔ وہ جب سامنے سے گزرتی تھی تو بس پتہ چلتا تھا کہ اب میرا محبوب یہاں سے گزر رہا ہے۔ ایک سفید

ساہیولہ سا ہوتا اور ہلکی سی مہک آتی۔ میں ایک دم تروتازہ ہو جاتا۔ باقی پورا ہفتہ پلنگ پر بیماروں کی طرح پڑا رہتا۔

ایک دن کرامت آیا اور دیکھ کر بہت خوش ہوا۔۔اس دن جمعہ تھا، کہنے لگا، اس گاؤں پر جمعرات اور جمعہ کے دن زیادہ کرم ہوتا ہے۔ ہر جمعرات دھمال ہوتی ہے اور جمعہ تو سارا دن نیاز تقسیم ہوتی ہے۔ دیکھ تو بھی جمعرات جمعہ کو کتنا بہتر ہو جاتا ہے۔ بچپن میں کہیں درختوں کے سائے میں تو نہیں کھیلتا تھا۔ سنا ہے بچپن میں کبھی سایہ ہوا ہو تو جوانی میں اثر کر سکتا ہے۔ ورنہ دیکھ تیرا زخم تو معمولی سا تھا کتنا بگڑ گیا ہے۔ جمعرات جمعہ تو اٹھتا ہے، اندر باہر ہوتا ہے، باقی پورا ہفتہ پلنگ پر پڑا رہتا ہے۔ کل تو بڑے سائیں بھی پوچھ رہے تھے کہ مہمان کا جب تک جی چاہے رہے مگر پوچھ کے بتانا مسئلہ تو نہیں کوئی۔ جی ہی جی میں شرمندہ ہوا۔ مگر کیا کرتا۔ دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ مسئلہ بیان کرتا تو کیا کرتا۔ ایک دن خبر ملی کہ بی بی صاحبہ پیر کے روز دربار جا رہی ہیں۔ میں نے دلیر خان کو پہلے ہی کہہ دیا کہ مجھے پیر کو دربار جانا ہے۔ جی بہت عجیب سا ہے تھوڑا سکون چاہتا ہوں۔ دلیر خان نے کہا، ہاں ٹھیک ہے۔ میں بندوبست کروادوں گا۔ میرے پیر اب تھوڑا بہتر ہو رہا تھا مگر مکمل طور پر ٹھیک نہ تھا۔

'تو آپ بی بی صاحبہ کی محبت میں گرفتار ہو چکے تھے؟' مشراز نے پوچھا۔

'ایسے نہ کہہ۔۔۔۔بے حرمتی ہوتی ہے۔۔۔' بابا نے کہا۔

'پھر کیا ہوا؟' اس نے انہماک سے پوچھا۔

'کچھ کہہ نہیں سکتا۔۔۔کہوں گا۔۔۔تو سمجھ نہیں پائے گا تُو۔۔۔آج میں تجھے خود سنا رہا ہوں۔۔۔کیونکہ میری ضرورت ہے۔۔۔باقی تب سناؤں گا جب تجھے ضرورت ہو گی۔' بابا چراغ دین نے کہا۔

....

'بھائی شیرو۔۔۔تم مہرو باجی کی شادی پر آئے ہو؟' شیرو کی بہن نے پوچھا۔

'کیا۔۔۔مہرو باجی کی شادی؟' مشراز نے حیرت سے پوچھا۔

'ہاں۔۔۔' اس نے بھائی سے بیگ پکڑتے ہوئے کہا۔

'اماں کہہ رہی تھیں کہ ہم پورا ایک مہینہ پہلے جائیں گے۔' اس نے بتایا۔

'سلام اماں۔۔۔' شیرو نے جھکتے ہوئے ماں کو سلام کیا۔

'آ گیا میرا شیرا۔۔۔ مجھے پتہ تھا۔ ادھر چھٹی ہوئی۔ ادھر وہ جھٹ سے آ جائے گا۔' ماں نے کہا۔

'ہاں ماں۔۔۔آ گیا۔۔۔' شیرو نے کہا۔

اتنے میں گڑیا پانی لے کے آ گئی۔

'لو بھائی پانی۔' گڑیا نے کہا۔

وہ آہستہ آہستہ پانی پینے لگا۔

'خیر ہو میرا بیٹا بجھا بجھا سا ہے۔' ماں نے پوچھا۔

'کچھ نہیں ماں۔' شیرو نے جواب دیا۔

'شام ڈھلے آیا ہے، تو نے تو کل صبح آنا تھا۔' ماں نے پوچھا۔

'ہاں ماں دیر سے نکلا تھا۔ ایک دوست کے ساتھ تھا۔ اس نے رُکنے کو کہا تو رُک گیا۔' شیرو نے کہا۔

'ماں دوست تھا یا سہیلی۔' گڑیا ہنسنے لگی۔

شیرو کے ذہن میں ایک دم نازلی کا خیال آیا۔

'بھائی کا رنگ اُڑ گیا ہے۔ اماں پوچھو تو صحیح شہری میم ہی تھی نا۔۔۔شہری بابو تو نہیں لگتا مجھے۔' گڑیا نے پانی کا گلاس اُٹھاتے ہوئے کہا۔

'ہائے میرا بچہ۔۔۔لے اُڑی وہ شہری میم۔۔۔تو مجھے بتا کتنا رہ گیا ہے۔۔۔تو واپس آ۔۔۔بس تو جائے گا ہی نہیں بس۔۔۔' ماں کا رونا پیٹنا شروع ہو گیا۔

'ماں یہ گڑیا بھی ناں۔۔۔۔وہ یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔'

'اماں۔۔۔ بھائی آج پریشان تھا۔ میں نے تو مذاق کیا اور وہ غصے میں اُٹھ ہی گیا۔' گڑیا نے کہا۔

'تیری زبان قابو میں کہاں رہتی ہے، جا دیکھ اُسے۔'ماں نے کہا۔

'رُک، پوچھنا بھی کہ کہیں سچ مچ کسی میم کا چکر تو نہیں۔'ماں نے اُسے روکتے ہوئے کہا۔

نائلہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور کہا،'لو کر لو بات!!۔'

....

شام ڈھلنے کو تھی۔ سورج کی زردی ہر سُو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تالاب کے کنارے پتھر لے کر بیٹھا تھا اور باری باری ایک ایک پتھر پانی میں پھینکنے لگا۔

اس کے ذہن میں نازلی کی تمام گفتگو چل رہی تھی۔

'مشراز، تم گاؤں کب جا رہے ہو؟' اس نے پوچھا۔

'آج۔'مشراز نے جواب دیا۔

'تم نے بتایا ہی نہیں، واپسی کب ہے؟' اس نے پوچھا۔

'بتانا ضروری تھا کیا؟' اس نے پوچھا۔

'نہیں۔ ویسے ہی۔۔۔' نازلی نے کہا۔

وہ ایک دم بجھ سی گئی۔

'کہتی ہو تو نہیں جاتا۔'مشراز نے کہا اور ہنسنے لگا۔

'کیا ایسا ہو سکتا ہے؟' نازلی نے پوچھا۔

'نہیں۔'مشراز نے کہا اور ہنسنے لگا۔

وہ افسردہ تھی۔ میرے جانے پر یا معلوم نہیں کس بات پر۔

’تم اداس ہو۔‘مشراز نے پوچھا۔

’نہیں۔‘اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ وہ یونیورسٹی کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔آس پاس گہری خاموشی اور کچھ پرندوں کے بولنے کی آواز تھی۔

وہ گھاس توڑ توڑ کے اپنے سامنے رکھ رہی تھی اور مشراز وہ گھاس بکھیر رہا تھا۔اس نے مشراز کا ہاتھ پکڑا اور کہا،’مشراز۔‘

وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ نازلی بولڈ سی لڑکی تھی۔ ہاتھ پکڑنا دوستی میں عام سی بات تھی۔مگر آج اس کے ہاتھ پکڑنے میں التجا تھی۔

’کچھ دیر رُک جاؤ۔‘نازلی نے کہا۔

وہ مُسکرانے لگا۔’ٹھیک ہے۔کل چلا جاؤں گا۔‘

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھنے لگا۔

’چلو آؤ آج ایک نئے جگہ لے کر چلتا ہوں۔‘مشراز نے کہا۔

’کہاں۔‘نازلی نے پوچھا۔

’فالودہ کھانے۔‘وہ ہنسنے لگا۔

’فالودہ۔‘وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

’کبھی نہیں دیکھا؟‘مشراز نے پوچھا۔

’دیکھا بھی ہے اور کھایا بھی ہے اور جانتا ہوں تمہیں پسند بھی ہے۔اس لئے۔۔۔ چلو آؤ۔۔۔‘مشراز نے کہا۔

وہ ہنس رہی تھی۔اس کی مسکراہٹ میں تمام جذبات تھے۔خوشی،دُکھ،مُسکراہٹ ،شوخی،سادگی مگر ایک وہم۔۔۔۔ایک گمان بھی تھا‘

خیالات کے اس تسلسل کو رفیق نے توڑا۔۔۔

'شیرو۔۔۔تو کہاں غائب ہے۔۔۔کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔۔۔' رفیق نے کہا۔

وہ بغیر جواب دیئے اُٹھ کھڑا ہوا اور رفیق سے ملنے لگا۔' آجا۔بیٹھ۔۔۔'

'خیر نہیں ہے آج۔۔۔اتنا چُپ چاپ ملا ہے۔۔۔کوئی مسئلہ ہے؟' رفیق نے پوچھا۔

'بس یار۔۔۔ایسے ہی۔۔۔' مشراز نے کہا۔

ساری رات وہ دونوں تالاب کے کنارے بیٹھے رہے۔

'رفیق یار۔۔۔عجیب سی پریشانی ہے۔سمجھ بھی نہیں آتا کہ کس بات کی پریشانی ہے۔عجیب سا بجھا بجھا سا دل ہے۔اچانک ہی کچھ ہوا۔۔۔سمجھ ہی نہ پایا۔سوچ رہا تھا بابا فقیرے کے پاس جاؤں۔۔۔مگر ہمت نہ ہوئی کہ کہیں وہ جان نہ جائے۔۔۔' اس نے کہا۔

'یعنی شیرو۔۔۔تو جانتا ہے کہ کیا ہوا ہے اور تجھے ڈر ہے کہ وہ جان نہ جائے۔' رفیق نے کہا۔

'معلوم نہیں یار۔۔۔' شیرو نے کہا۔

'میں پوچھنا نہیں چاہ رہا کیونکہ بعض اوقات انسان کسی سے اپنا دکھ بانٹنا نہیں چاہتا مگر تیری سہولت کو کہتا ہوں کہ تجھے سکون ہو۔۔۔خود سے ہی بانٹ لے۔یہیں بیٹھا رہ۔بے شک پانی سے باتیں کر۔۔۔میں چلتا ہوں' اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا آخری پتھر پانی میں پھینک دیا۔

شیرو اس پتھر سے پڑنے والی لہریں پانی میں دیکھنے لگا۔

اُس کی مسکراہٹ بھی ایسی تھی۔ان لہروں کی طرح، ہر لہر ایک الگ پیغام دے رہی تھی۔خوشی کا، محبت کا، سادگی کا، وفا کا۔۔۔مگر اس سب سے چھوٹی لہر کی طرح، جو سب سے قریب تھی، جدائی کا خوف بھی تھا۔

....

سرگودھا (رسول آباد)

'تو آپ آ ہی گئے۔۔۔باجی مہرو کی شادی کی تاریخ رکھ رہے ہیں ہم۔' رانو نے کہا۔

'ہاں۔۔۔اماں نے بھیجا ہے۔۔۔ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔۔۔انہوں نے کہا کہ ان کے حصے کا میں ہو آؤں۔' مشراز نے جواب دیا۔

اتنے میں مہرو۔۔۔پانی کا گلاس لے کر آ گئی۔سُرخ رنگ کا جوڑا پہنے ہوئے تھی۔ وہ اتنی حسین تو نہ تھی۔ عام سی شکل وصورت تھی گندمی رنگت کی لیکن ہاں وقت اور حالات کا عکس اس کے چہرے سے دکھتا تھا۔عمر بھی لگ بھگ کوئی 31 سال ہو گی اب۔مگر اس کی سادگی میں وہ ادا تھی جو رانو جیسی حسین، خوبصورت اور نازلی جیسے بولڈ، حسین، دولت مند لڑکی میں بھی نہ تھی۔وہ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔شاید آج پہلی بار وہ نظر بھر کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

'مبارک تو دیجئے۔مہرو باجی کو۔۔۔ان کی شادی ہونے والی ہے۔۔۔' رانو اُچھلتی ہوئی آئی اور مہرو کے گرد اپنی بانہیں ڈال لیں۔

'مہرو باجی آپ ہمیں چھوڑ کے چلی جائیں گی؟' رانو نے کہا۔

'لو مشراز پانی پیو۔۔۔' مہرو نے کہا۔

مشراز نے بغیر کچھ کہے۔پانی کا گلاس اُٹھا لیا اور دو چار گھونٹ پی کے واپس رکھ دیا۔

'آپ کی پیاس بجھ گئی؟ پچھلی بار تو غٹ غٹ پانی پی جاتے تھے۔۔۔گھر کے لیموں کا شربت ہے۔۔۔مہرو باجی نے بنا دیا ہے۔۔۔' رانو نے کہا اور اُٹھا کر پینے لگی۔

'رانو۔۔۔وہ ابھی پی رہا تھا' مہرو نے کہا۔

'میں ان کو آپ سے زیادہ جانتی ہوں۔۔۔وہ پی چکے تھے۔۔۔اب انہیں چائے پینی ہے۔' رانو نے کہا۔

'چائے پیو گے مشراز؟' مہرو نے پوچھا۔

'جی۔۔۔' مشراز نے جواب دیا۔

رانو مسکرانے لگی۔

'تو جائیے بنائیے چائے۔۔۔' رانو نے کہا۔

وہ کچھ دیر مشراز کے پاس بیٹھی رہی۔

'خالہ کہاں ہیں۔۔۔ وہ مہرو باجی کے سسرال۔ کچھ بات چیت کرنے۔' رانو نے کہا۔

'اچھا تو بات پکی نہیں ہوئی کیا؟' مشراز نے پوچھا۔

'اصل میں مہرو باجی کے ہونے والے شوہر، نوید بھائی کی ایک بیٹی ہے۔ شادی کے بعد وہ خود اور مہرو باجی کو لاہور میں رکھیں گے۔ یہ طے ہوا تھا پہلے۔ مگر اب سننے میں آیا ہے کہ وہ بچی بھی ساتھ رہے گی تو اماں کچھ بات چیت کے لئے گئی ہیں۔'

'کیا۔۔۔' مشراز نے حیرت سے پوچھا۔

'آپ یہاں بیٹھئے۔۔۔۔ میں ابھی آئی۔۔۔'

رانو بھاگی بھاگی چھت پہ چڑھی اور اپنی سہیلی کو آواز دینے لگی۔

'کیا ہے رانو، کیوں شور مچایا ہوا ہے؟' کرن نے کہا۔

'وہ آئیں ہیں۔۔۔ آجا ہماری چھت پہ۔۔۔ میں ان کے ساتھ بیٹھ کے باتیں کروں گی۔ تم دیکھنا۔۔۔ کتنی جچتی ہے ہماری جوڑی۔۔۔ دے ہاتھ دیوار چڑھاؤں۔۔۔' رانو نے کہا۔

'ہائے سچی۔۔۔۔ وہ دیوار پر ہی بیٹھ گئی۔۔۔ شہر میں ہوتا ہے ناں۔۔۔ تیری خالہ کا بیٹا۔۔۔' رانو شرمانے لگی۔

'وہ شہزادی کے منگیتر سے بھی زیادہ حسین ہے اور پڑھا لکھا بھی ہے۔ اس کا

منگیتر تو دکان پہ بیٹھتا ہے۔ یہ تو شہر میں ہوتا ہے۔ اچھی نوکری کرے گا۔۔۔ اچھا باتیں چھوڑ۔۔۔تو آ چھپ کے دیکھنا۔ پھر سب کو بتانا' وہ چھت پر خوشی سے گھومنے لگی۔

'اچھا میں چلتی ہوں۔۔۔تو آنا۔۔۔۔' رانو نے کہا۔

'مشراز مہرو کے شوہر کے بارے میں سنتے ہی برآمدے میں گیا جہاں وہ کھڑی الماری سے کپ نکال رہی تھی۔

وہ اداس تھی اور آنکھیں بھی نم تھیں۔

'آپ خوش نہیں ہیں اس شادی سے۔۔۔؟' مشراز نے پوچھا۔

مہرو نے کوئی جواب نہ دیا۔

'بتائیں ناں۔۔۔' مشراز نے اصرار کیا۔۔۔

اب کی بار اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

'آپ خوش نہیں تو خالہ زبردستی نہیں کر سکتیں۔۔۔آپ بے فکر رہیں۔ میں اماں سے بھی بات کروں گا۔۔۔' وہ مہرو کو کاندھوں سے تھامے کھڑا تھا۔

اس کا بے اختیار دل چاہا کہ وہ دن آئے جب وہ سرخ جوڑے میں مہرو کا ہاتھ تھامے یوں ہی کھڑا ہو۔ اس کا سہارا بن کے۔ جب کسی کا بھی ڈر نہ ہو۔۔۔ وہ اس کے گالوں پر چمکتے آنسوؤں کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک مسکرانے لگا۔ مہرو کو اپنانے کے خیال نے ہی اس کا اتنا سکون دیا کہ وہ جان گیا اس کی بے سکونی کی وجہ کیا ہے۔

اتنے میں رانو برآمدے میں داخل ہوئی۔

'رانو ادھر آؤ۔۔۔ یہ کپ پکڑو اور ہم دونوں کے لئے چائے لے کر آؤ۔' وہ مہرو کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اُسے باہر لایا۔۔۔

'ہاں ذرا اچھی چائے ہو ورنہ دوبارہ بنواؤں گا۔' مشراز نے کہا۔

....

گوکھووال (فیصل آباد)

وہ سرگودھا سے فیصل آباد کے لئے بس میں روانہ ہوا۔ پورا راستہ وہ یہی سوچتا رہا کہ اتنی بے چینی تھی، اتنی بے سکونی تھی اور اچانک اب اتنا سکون۔۔۔ آس پاس کھیتوں سے ہوتے ہوئے وہ مختلف شہروں اور گاؤں سے گزرا۔ کچھ معلوم نہ تھا کون آیا کون گیا۔ جب گوکھووال پہنچا تو بس والے نے کہا۔

'شیرو سرکار۔۔۔ آپ کا گاؤں آ گیا۔۔۔ کیا جانے کا ارادہ نہیں یا منزل کچھ اور ہے۔'

'نہیں چاچا اُترنا تو یہیں ہے۔۔۔ مگر منزل کہاں ہے یہ معلوم نہیں۔' وہ مسکراتا ہوا یہ کہہ کر اُتر گیا۔

پورا رستہ کہیں نہ رُکا۔ سیدھا گھر گیا۔

دروازہ کھٹکھٹایا۔

'ارے اس ٹائم کون آ گیا' ماں نے آواز لگائی۔۔۔

'ارے نائلہ۔۔۔ دیکھ تو ذرا۔۔۔'

'اماں میں شیرا۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'بسم اللہ۔۔۔ بسم اللہ۔۔۔ کھول۔ میرا شیرا آیا ہے۔'

'جا رہی ہوں اماں۔۔۔' نائلہ نے کہا اور دروازہ کھولا۔

'آ بھی گئے بھائی۔۔۔' اس نے پوچھا۔

'ہاں۔۔۔ اس نے جواب دیا۔

'سلام اماں۔۔۔' مشراز نے کہا۔

نہ جانے ساری خوشی، سارا سکون ایک دم کہاں غائب ہو گیا۔

وہ کبھی اپنے کمرے میں بیٹھتا تو کبھی صحن میں اور کبھی چھت پر چلا جاتا۔ گھر سے باہر جانے کا دل تھا نہ اندر بیٹھنے کا۔

'آ گیا اتنی جلدی۔۔۔ تُو تو کچھ دن ٹھہرنے گیا تھا۔' ماں نے پوچھا۔

'ہاں خالہ خالو گھر میں نہیں تھے۔ مجھے رکنا مناسب نہ لگا۔' مشراز نے کہا۔

'شیرو بیٹا کوئی بات ہے تو بتا۔۔۔ تو بہت پریشان ہے جب سے آیا ہے۔' ماں نے کہا۔

'نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'تیری ماں ہوں۔۔۔ سمجھتی ہوں سب۔۔۔' ماں نے کہا۔

'نہیں۔۔۔' وہ یہ کہہ کر اُٹھ گیا۔

رات یوں ہی کٹ گئی۔۔۔ کبھی چھت پر تو کبھی چہل قدمی کرتے ہوئے۔ صبح ہوئی تو مشراز کمرے میں تھا۔ کرسی سے ٹیک لگائے، دیوار گُھور رہا تھا۔۔۔

'اے شیرو۔۔۔ میں کل سے دیکھ رہی ہوں۔۔۔ کیا بات ہے بیٹا۔۔۔؟' ماں نے پوچھا۔

'کچھ نہیں ماں۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'پھر بھی بیٹا۔۔۔' ماں نے پوچھا۔

'مہرو۔۔۔ خوش نہیں ہیں شادی سے۔' مشراز نے کہا۔

'یہ کس نے کہا؟' ماں نے پوچھا۔

'میری بات ہوئی تھی اور وہ بندہ پہلے سے شادی شدہ بھی ہے۔۔۔' مشراز نے ماں کو بتایا۔

'مگر بیٹا۔۔۔ مہرو کی بھی عمر نکل رہی ہے۔۔۔ اور تیری خالہ کو وہی بہتر لگا ہوگا۔' ماں نے کہا۔

'کیا عمر نکل رہی ہے ماں۔ جو صحیح وقت ہے تب ہی ہونا۔۔۔پھر فکر کیسی۔۔۔
اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ کہیں بھی کر دیں۔' مشراز نے کہا۔

'تو بیٹا۔۔۔اب تو بات بھی طے ہو چکی۔۔۔تو دفعہ کر۔۔' ماں نے کہا۔

'اماں۔۔۔' مشراز نے جھجکتے ہوئے کہا۔

'بول بیٹا۔۔۔' ماں نے کہا۔

'آپ میری بھی شادی کی بات کر رہی تھیں ناں۔۔۔تو آپ خالہ سے بات کرلیں۔۔۔' مشراز نے کہا۔

مجھے پتہ تھا، تو میرا بیٹا ہے۔۔۔میری پسند ہی تیری پسند ہوگی۔ تیری خالہ کو میں پہلے ہی کہہ چکی کہ بس اب مشراز جب تک خود نہ کہے تب تک بات نہ کروں گی۔تو نے دل جیت لیا میرا۔۔۔' ماں نے کہا۔

ماں کے اس رویے پر مشراز حیران ہوا۔

'آپ کریں گی ناں بات؟' مشراز نے پوچھا۔

'ہاں بیٹے۔۔۔بس رانو دسویں پاس کرلے۔۔۔بس اسی دن تیرا رشتہ لے جاؤں گی۔' ماں نے کہا۔

'اماں رانو ابھی بچی ہے۔۔۔میں رانو کی نہیں۔۔۔مہرو کی بات کر رہا ہوں۔' مشراز نے کہا۔

'تیرا دماغ ٹھیک ہے؟؟' ماں نے پوچھا۔

'اس میں حرج ہی کیا ہے؟' مشراز نے پوچھا۔

'حرج۔۔۔؟' ماں نے غصے سے کہا۔

'وہ عمر میں بڑی ہے تجھ سے۔۔۔' ماں نے کہا۔

'ماں عمر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔کہیں لکھا تو نہیں ہے ناں کہ لڑکی چھوٹی ہی

ہونی چاہئے۔۔۔'مشراز نے کہا۔

'چار جماعتیں اس لئے نہیں پڑھائی کہ مجھے سکھائے۔رانو میں کیا برائی ہے؟'

ماں نے پوچھا۔

'مہرو میں بھی تو کوئی برائی نہیں۔'مشراز نے کہا۔

'وہ رشتہ میں تیری خالہ لگتی۔۔۔'ماں نے کہا۔

'میری چاچی کے بھائی کی بیٹی۔۔۔'ماں نے رشتہ سمجھاتے ہوئے کہا۔

'اُف۔۔۔'مشراز نے کہا۔

'وہ بہت اچھی ہیں ماں۔۔۔سلیقہ شعار،عقلمند۔۔۔mature۔۔۔سب سے بڑھ کر کہ میری سوچ ان سے ملتی۔۔۔رانو بچی ہے۔۔۔'مشراز نے کہا۔

'میں بھی شادی کے وقت چودہ سال کی تھی اور تمہارے ابا۔۔۔بیس سال کے۔۔۔'ماں نے کہا۔

'اماں۔۔۔وہ وقت اور تھا۔۔۔سب سے بڑھ کر مجھے مہرو پسند۔۔۔میں ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔۔مجھے تکلیف ہوتی ہے۔۔۔میں انہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔'مشراز نے کہا۔

'ماں چاہے روتی رہے۔۔۔'ماں نے کہا۔

'نہیں اماں۔۔۔اللہ نہ کرے۔۔۔'مشراز نے کہا۔۔۔

'بس۔۔۔اب ایک لفظ نہ کہنا۔'

'اماں۔۔۔'مشراز نے کچھ کہنا چاہا۔۔۔

'بات ختم ہوگئی ہے۔۔۔پورا گاؤں مجھے بغیر مانگے میرے بیٹے کا رشتہ دے دے۔۔۔ایک سے ایک حسین مگر تو۔۔۔اس ادھیڑ عمر عورت۔۔۔'ماں نے کچھ کہنا چاہا۔

'اماں۔۔۔مجھے کہہ لیجئے جو کہنا ہے۔۔۔ان کو نہ کہئے۔۔۔'مشراز نے کہا۔

'واہ۔ یہ نوبت آنی تھی کہ تو ماں کو بتائے گا کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ کمال ہے۔'ماں نے کہا۔

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔'میں جا رہا ہوں ماں۔'اس نے کہا اور سامان باندھنے لگا۔

گڑیا چائے لے کر آئی۔۔۔

'یہ کیا۔ اتنی جلدی جا بھی رہے ہیں بھائی۔'گڑیا نے پوچھا۔

مشراز نے کوئی جواب نہ دیا۔۔۔

'رانو کی دسویں پاس ہوتے ہی میں تیری بارات لے جاؤں گی۔ تب تک جا۔۔۔ پڑھ جا کے۔۔۔'ماں نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

'اگلے مہینے کی بیس تاریخ کو اس کی ڈولی اُٹھ رہی ہے۔۔۔۔ برداشت نہیں کر سکتا ہو تو بھلے نہ آنا۔۔۔۔۔۔مگر وہ اس گھر کی بہو نہیں بن سکتی۔'ماں نے کہا اور چلی گئی۔

'بھائی۔۔۔ ہوا کیا ہے؟ اماں کس کی بات کر رہی ہیں۔۔۔ ایسے کیوں جا رہے ہیں۔ نہ جائیں۔'گڑیا بولتی چلی جا رہی تھی۔

....

ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہوا میں ہلکی ہلکی نمی تھی۔۔۔ کنویں کے پاس چار پائیاں بچھی تھیں۔ بزرگ عورتیں مرد سب وہیں بیٹھے تھے۔ حقے کی گڑ گڑ تھی اور ٹیوب ویل چلنے کی آواز۔۔۔ پھر ایک آواز آئی۔

'کتنا تابع فرمان سمجھتے تھے ہم۔'چاچا حلیم نے کہا۔

'او کس نے بات کر رہے ہو؟'علم دین نے حقہ اپنی طرف کرتے کہا۔

'اپنا شیرو۔۔۔'چاچا نے جواب دیا۔

'کیا ہوا اس کو؟'علم دین نے پوچھا۔۔۔

'ماں سے لڑ جھگڑ کے گھر چھوڑ کے چلا گیا ہے۔۔۔ کہتا ہے واپس نہ آؤں گا۔۔۔

وہیں گھر بسالوں گا۔۔۔' چاچانے کہا۔

'اوہ خیر۔۔۔ایسے کہااس نے؟' علم دین نے پوچھا۔

'ہاں۔۔۔تائی حاجن سے پوچھ لے۔

'کیوں بھرجائی۔۔۔بتاناں۔۔۔' چاچانے کہا۔

'ہاں۔۔۔میں لسی لینے گئی تو اندر سے شور آرہا تھا۔۔۔پھر کچھ دیر بعد شیرو بیگ اُٹھا کے جارہا تھا۔۔۔ابھی رات کو تو آیا تھا۔۔۔میں سمجھ گئی کوئی میم کا قصہ ہے۔' حاجن نے بڑھ چڑھ کر بتایا۔۔۔

'یہ ہے شہر بھیجنے کا انجام۔۔۔چوہدری تو اپنا سامنہ لے کے بیٹھا ہے۔ بڑا دل تھا اپنی بیٹی دینے کا اس کا۔' علم دین نے کہا۔

'سُنا ہے اس کی ماں بھی بستر پہ پڑ گئی ہے۔۔۔اکلوتا بیٹا تھا۔۔۔وہ بھی نافرمان نکلا۔۔۔' چاچانے کہا۔

....

بابا چراغ دین

'جس تن لاگے سوتن جانے'۔۔۔بابا چراغ دین نے قہقہہ لگایا۔

'عشق بڑا رتبہ عطا کرتا ہے۔۔۔بہت سوں کو افسر بناتا ہے تو بہت سے ایسے بھی ہیں جن کو فقیر بنا ڈالتا ہے۔' مشراز سر گھٹنوں میں چھپائے بیٹھا تھا۔ایک دم نظر اُٹھا کر بابا چراغ دین کی طرف دیکھا۔

ایک قہقہہ گونجا۔۔۔۔۔۔'حق !!۔۔۔۔۔۔حق کی صدا۔۔۔بس وہی حق ہے وہی سچ۔۔۔باقی سب فانی۔۔۔باقی سب فانی۔۔۔' بابا چراغ دین نے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

'ٹھوکر، ٹھوکر اور ٹھوکر۔۔۔۔ گر جاؤں۔۔۔۔دیکھو مٹی لگی ہوگی۔۔۔ پھرا ٹھو۔۔۔جھاڑو خودکو۔۔۔۔مٹی صاف کرو۔۔۔۔سب صاف۔۔' بابا چراغ دین نے کہا۔

'یہ جو سب دیئے جلانے آتے ہیں۔یہ سب۔۔۔۔سب کھوٹے ہیں۔۔۔جس کی لگن سچی۔۔۔۔اس کے دل میں ہی دیا جل جاتا ہے۔۔۔محبت کی آگ میں سلگتا رہتا ہے۔۔۔۔

وہ سچی لگن میں نہیں آتے۔۔۔وہ کسی کے کہنے پہ آتے ہیں۔۔۔فلاں نے یہ کہا۔۔۔فلاں کی یہ مراد پوری ہوئی تو مجھے بھی جانا۔۔۔۔نہ۔۔۔نہ نہ۔۔۔۔۔۔

سچی لگن خود ایک دیئے کی مانند ہوتی ہے۔۔۔دل سے بڑا دربار کون؟؟اور عاشق سے بڑا پیر کون؟؟'

....

لاہور

'کیا ہوا؟ پریشان ہو؟؟' نازلی نے پوچھا۔

'نہیں۔۔۔' مشراز نے جواب دیا۔

'چائے پیو گے؟'

'نہیں۔۔۔'

'گھر سے آئے ہو؟'۔

'ہاں۔۔۔'

'کیا ہاں، نہیں لگا رکھی ہے۔' نازلی نے اپنے سامنے اکٹھی کی ہوئی گھاس اس پر پھینکتے ہوئے کہا۔

'اور کیا جواب دوں؟؟ ان سوالوں کا جواب ہاں۔۔۔نہیں۔۔۔ہی ہے۔۔۔

'اب واپس کب جانا ہے؟'

'تمہیں کیا جلدی ہے؟ میرے واپس جانے کی۔۔۔'

'ویسے ہی پوچھا ہے۔نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتاؤ۔۔۔تمہاری مرضی۔۔۔'

'اماں نے کہا ہے۔۔۔آجانا۔۔۔اکتوبر کی بیس تاریخ کو۔۔۔اگر برداشت کر سکوتو۔۔۔'

'برداشت۔۔۔؟؟ کیا برداشت۔۔۔'نازلی نے پوچھا۔

'کچھ نہیں۔۔۔'

'پھر بھی مشراز۔۔۔آدھے ادھورے جملے۔۔۔'اس نے کہا۔

'چائے پئو گی؟؟ آؤ چلیں۔۔۔'مشراز اٹھا اور کپڑے جھاڑنے لگا۔۔۔

نازلی اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔وہ آگے آگے چلنے لگا۔۔۔وہ بھاگتی ہوئی اس کے پیچھے گئی۔

'تم چائے پینے کس کے ساتھ جارہے ہو؟'نازلی نے پوچھا۔

'تمہارے علاوہ کوئی ہے یہاں؟'اس نے پوچھا۔

'نہ۔۔۔کوئی نہیں ہے یہاں میرے سوا۔۔۔'وہ ہنسنے لگی۔

'توظاہری بات ہے تمہارے ساتھ ہی جارہا ہوں'مشراز نے کہا۔

'ڈگری ختم ہورہی ہے۔۔۔'نازلی نے کہا۔

'اسی لئے اداس ہو؟'وہ ہنسنے لگی۔

اس نے ایک تیکھی نگاہ اس پہ ڈالی۔

'غصہ کیوں ہورہے ہو۔۔۔مذاق کیا ہے۔۔۔'نازلی نے کہا۔

وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔۔۔مُسکراتے ہوئے اور خود سے کہنے لگی۔۔۔'نہ جانے یہ تم سے کب کہوں گی۔۔۔تمہارا غصہ، مسکراہٹ۔۔۔۔بے رُخی۔۔۔سب

اچھا لگتا ہے۔۔۔سب پہ مسکرانے کو جی چاہتا ہے۔۔۔'وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔

'ایسا کیا ہوگیا نازلی۔۔۔جو یوں مسکرائے چلی جا رہی ہو'مشراز نے کہا۔

'کچھ نہیں۔۔۔چائے آرڈر کرو۔۔۔'اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

....

سرگودھا(رسول آباد)

'مہرو۔۔۔سب تیاریاں ہیں ناں تیری۔۔۔۔'خالہ نے پوچھا۔

'جی خالہ۔۔۔'مہرو نے جواب دیا۔

'میری پیاری بیٹی۔۔۔'خالہ نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

'بہت پیار آرہا ہے اماں۔۔۔۔مہرو باجی پہ۔۔۔۔'رانو نے کہا۔

'ہاں۔۔۔۔کیوں نہ آئے۔۔۔۔پیاری بیٹی ہے میری۔۔۔۔'خالہ نے کہا۔

مہرو کی آنکھیں بھر آئیں۔۔۔۔

'بس بیٹا۔۔۔جی میلا نہ کر۔۔۔۔بہت اچھے لوگ ہیں۔ بڑا اچھا۔۔۔شہری لڑکا۔۔۔۔مجھے تیرے لئے بہت پسند آیا۔۔۔پہلی بیٹی کی فکر نہ کر۔۔۔۔تیرا اپنا گھر ہو گا۔۔۔اس بات پہ نہ جی میلا کرنا۔۔۔مگر مجھے تیرے لئے مناسب لگا'خالہ نے کہا۔

'اماں کیا سارا سبق آج ہی سنائیں گی؟'رانو نے کہا۔

'چُپ کر۔۔۔۔جا پانی لے کے آ۔۔۔'خالہ نے کہا۔

'آپ بھی شیرو کی طرح مجھے بھیج دیا کریں جب بھی باجی سے بات کرنی ہوتی۔۔۔کبھی چائے لا۔۔۔کبھی باداموں والا دودھ لا۔۔۔'وہ بولتی ہوئی جا رہی تھی۔

بس جب نکاح ہونے لگے ناں تو میری رانو کے لئے بھی دعا کرنا کہ گوکھووال والے فوراً سے آجائیں رشتہ لے کے۔ بڑا ہی سوہنا بھانجا ہے میرا۔۔۔رانو کے تو نصیب

کُھل گئے۔'

خالہ نے کہا۔

'یہ لیجئے پانی۔۔۔'رانو پانی لے آئی۔

'اماں۔۔۔۔خالہ کی طرف سے کون کون آئے گا۔۔۔؟'رانو نے پوچھا۔

'سب کو بُلا لیا۔۔۔خاص طور پہ کہا ہے انہیں کہ سب آ ئیں۔'خالہ نے جواب دیا۔

....

سرگودھا رسول آباد

بارات دروازے پہ کھڑی تھی۔ بینڈ باجا۔۔۔ خوب شوروغل تھا۔۔۔ ساتھ والے گھر کی چھت پر بارات کا انتظام تھا۔گھر کے صحن میں دُلہا اور باقی رسموں کے لئے ایک درمیانی عمر کا آدمی سر پر سہرا باندھے کھڑا تھا۔خالہ تیل لئے گھر کے دروازے پر کھڑی تھی۔رانو اور گڑیا دونوں بارات کا راستہ روکے کھڑی تھیں۔

'آنے بھی دو اپنے بھائی کو اندر اب۔۔۔۔'خالہ نے کہا۔

'کوئی نہیں بہن۔۔۔بچیوں کے یہی شغل ہوتے ہیں،شادیوں میں۔۔۔۔'شیرو کی ماں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگی۔۔۔

'آنے دو بھئی آنے دو۔۔۔'خالہ نے کہا۔

دلہا نے کچھ رقم رانو کے ہاتھ میں دی اور اندر آنے کی اجازت چاہی۔

بینڈ باجے جاری تھی۔سب چارپائیوں اور کرسیوں پر بیٹھتے جا رہے تھے۔دلہا اور اس کے دوستوں کے لئے کرسیوں کا الگ انتظام کیا گیا تھا۔خوب ہنگامہ تھا۔لڑکیاں مہرو

کے کمرے میں بیٹھیں ڈھولک بجارہی تھیں۔

'اے باجی ۔۔۔شیرونہیں آیا۔۔۔'رانو کی ماں نے پوچھا۔

'نہیں۔۔۔۔بہن ۔وہ اس کے امتحان تھے ناں۔'اس نے جواب دیا۔

'اوہو۔۔۔مہرو کی شادی پہ تو اس کو آنا چاہئے تھا۔'خالہ نے کہا۔

'ہاں بس۔۔۔'شیرو کی ماں کوئی جواب نہ دے سکی۔

ایک کونے میں لڑکیوں کا ٹولہ تھا۔۔۔ایک طرف عورتیں مل کر بیٹھی تھی تو دوسری طرف رشتہ دار برادری کے لوگ۔۔۔۔

رانو کی سہیلی بھاگتی ہوئی آئی۔۔۔

'سن رانو۔۔۔'

'ہاں۔۔۔'رانو نے جواب دیا۔

'وہ آیا ہے۔۔۔تیرا ہونے والا۔۔۔'

'نہیں۔۔۔۔'رانو نے اداس ہوتے ہوئے کہا۔

'ارے۔۔۔۔میں تجھے بتا رہی ہوں۔۔۔آیا ہے۔۔۔'

مہرو سجی سنوری سُرخ جوڑے میں بیٹھی تھی۔ دلہن ہی تو تھی وہ۔۔۔ کچھ دیر کھڑا دروازے پر دیکھتا رہا۔۔۔ اچانک مہرو کی نظر پڑی تو کہا،'مشراز۔۔۔۔۔۔ اندر آ جاؤ۔۔۔ناں۔۔۔وہاں کیوں کھڑے ہو۔'

مشراز کی آنکھیں نم تھیں۔۔۔

'اندر نہیں آ سکتا۔۔۔۔'اس نے جواب دیا۔

'آ جاؤ۔۔۔'مہرو نے کہا۔

'نکاح ہو گیا یا ہونا ہے؟'مشراز نے پوچھا۔

وہ بمشکل بول پایا۔

'نکاح۔۔۔' مہرو ایک دم ساکت اس کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ زیرِ لب بڑبڑانے لگی۔۔۔

'نکاح۔۔۔'

نہیں۔۔۔۔پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

'چلو لڑکیو۔۔۔باہر چلو' خالہ کہتی آ رہی تھیں۔

'ارے میرے شیرو۔۔۔تُو آ گیا۔۔۔خالہ گلے ملتے ہوئے بولی۔

'مجھ سے ملا بھی نہیں سیدھا۔۔۔مہرو کے پاس آیا۔۔۔

'ہاں وہ۔۔۔ خالو نے کہا تھا کہ۔۔۔ دیکھ کے آؤ۔۔۔لڑکیاں تو نہیں ہیں۔۔۔' اس نے سوچ سوچ کے بولتے ہوئے کہا۔

مولوی صاحب بھی آ گئے۔مشراز کا دل جیسے باہر آ گیا ہو۔۔۔اس کے کانوں میں یہ آواز گونج رہی تھی۔۔۔

مہرین ولد عبدالجبار۔۔۔۔آپکو نکاح میں۔۔۔۔شفقت بن عنایت۔۔۔حق مہر بعوض تین سو روپے سکہ رائج الوقت قبول ہے؟؟

اس کی آنکھوں میں سمندر تھا جو طوفان کی صورت میں باہر آنے والا تھا۔وہ بہ مشکل اپنے احساسات چھپائے کھڑا رہا۔

اس سے پہلے کہ یہ سُنتا 'قبول ہے'۔۔۔وہ چلا گیا۔۔۔۔

بس میں سوار ہوتے ہی اسے مہرو سے ہونے والی گفتگو یاد آئی۔۔۔

'اگر پُر سکون اور آسان زندگی گزارنی ہے تو اس کا ایک ہی حل ہے۔۔۔ہر چیز کو تسلیم کر لو۔۔۔ ہر فیصلے کو۔۔۔ زندگی میں آنے والے ہر اُتار چڑھاؤ کو۔۔۔ ہر عروج و زوال کو۔۔۔بس خاموشی سے تسلیم کر لو۔۔۔زندگی میں اگر Accept کرنا سیکھ لیا تو زندگی آسان ہو جائے گی۔' اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا 'تو گویا آپ تسلیم کر چکی ہیں؟' اس نے

پُوچھا۔

'نہیں' اُس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

'کوشش کر رہی ہوں'۔

'اور یہ کوشش کب تک کامیاب ہوگی۔'؟ اُس نے پُوچھا

'معلوم نہیں۔ کچھ لوگ بہت جلدی accept کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ ساری عمر کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اور کچھ لوگ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ہار چکے ہیں۔ جنگ لڑتے رہتے ہیں۔ سارے پیادے، سپاہی، گھوڑے سب ختم۔ دشمن قلعہ فتح کر چکے ہیں۔ پھر بھی تنہا جنگ لڑتے رہتے ہیں۔ مگر اب کی باران کے مدِ مخالف وہ خود ہوتے ہیں۔ خود کو بار بار یقین دِلانے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔ کہ نہیں۔۔۔ ابھی نتیجہ نہیں نکلا۔۔۔

ابھی شکست نہیں ہوئی۔۔۔ ابھی بھی فتح کا امکان ہے۔۔۔ ابھی بھی بازی ہماری ہے اور مسلسل جنگ میں وہ کئی بار ہارتے ہیں۔'

اس کا قبول ہے کہنا، اس کو اپنی شکست لگا۔ 'کیا ایسے بھی کوئی ہار سکتا ہے؟' اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

تم نے قبول ہے سنا نہیں۔۔۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمہیں شکست نہیں ہوئی مِشراز علی۔ عموماً دل کی بازیوں میں شکست ایسے ہی ہوتی ہے۔ خاموشی سے۔ بنا کچھ کہے۔۔۔

....

گوکھووال (فیصل آباد)

کس نے بھیجا ہے؟' بابا چراغ دین نے پوچھا۔

'کسی نے نہیں۔۔۔' مشراز نے جواب دیا۔

'آہ۔۔۔کسی نے تو بھیجا ہے؟' بابا چراغ دین نے کہا۔

'نہیں۔۔۔' شیرو نے جواب دیا۔

'لے پانی پی۔۔۔' بابا چراغ دین نے مٹی کا پیالہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ پانی کے گھونٹ لینے لگا۔

'اس دن میں درگاہ پر نہیں گیا۔ مجھے محبت کی بے حرمتی ہوتی ہوئی دکھائی دی۔ میں کمی کمین تھا وہ بی بی صاحبہ۔۔۔جدی پشتی گدی نشین۔۔۔میری اوقات سے بڑھ کر لگا مجھے یہ سب۔ بس محبوب کی سوچ ہی سر تسلیم خم کر دیتی ہے۔۔۔نظارہ تو مار دیتا ہوگا۔۔۔یہی سوچ کر نہیں گیا کہ بس۔۔۔اسی در پر پڑا رہوں۔۔۔خاموشی سے۔۔۔'

'غلام حیدر۔۔۔بڑے سرکار نے بلایا ہے تجھے۔' دلیر خان نے کہا۔

میرا دل پھٹ گیا کہ جیسے۔۔۔جیسے میری ذلت کا پیغام آ گیا۔۔۔بڑے سرکار جس کو بھی بلائیں بڑے نصیب کی بات ہے مگر میرے دل میں چور تھا۔۔۔سو۔۔۔۔مجھے یہی دھڑکا لگا رہا کہ میں پکڑا گیا۔۔۔

بڑے بھاری دل کے ساتھ حاضری دی۔

'سرکار۔۔۔' میں جھک کر زمین پر بیٹھ گیا۔

'غلام حیدر۔۔۔ بہت خوبصورت نام ہے تمہارا۔۔۔ بالکل تمہاری طرح خوبصورت۔۔۔تمہارا نام ہی وجہ ہے کہ تم ابھی تک اس حویلی کی چار دیواری میں ہو۔۔۔ ورنہ کسی اور کو اجازت نہیں کہ یہاں آئے۔۔۔یہاں تک کے ہمارے ملازمین بھی جدی پشتی خدمت گزار ہیں۔۔۔سناؤ۔۔۔کیسی طبیعت ہے تمہاری؟؟'

'جناب۔۔۔!! کرم ہے اللہ پاک کا۔۔۔اور سیدوں کی دعائیں ہیں!۔۔۔ غلام بہتر ہے۔۔۔'

'اگر بہتر محسوس کرو تو ہماری درگاہ پہ ایک ملازم کی ضرورت ہے۔تم وہاں جا سکتے ہو۔۔کھانا پینا سب ہمارے ذمے۔۔۔ہمیں بس۔۔۔تابعدار غلام کی ضرورت ہے۔' پیر صاحب نے کہا۔

'غلام حاضر ہے جناب۔! جب کہیں گے رُخصت ہو جاؤں گا۔' غلام حیدر نے کہا۔

'جب بہتر محسوس کرو۔۔۔پہلے سوچنا۔۔۔یہ کام ہر کسی کا کام نہیں۔۔۔بس خاص الخاص کر سکتے ہیں اسے۔جنہیں اجازت ملے۔۔۔جن کا بلاوا آئے۔جاؤ تو خوشی سے جاؤ۔۔۔نہ جانا چاہو تو دلیر خان کو بتا دینا۔'

'سرکار۔نہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔آپ کا حکم۔سر آنکھوں پر۔۔۔کب روانہ ہونا ہے بتا دیجئے۔' غلام حیدر نے کہا۔

'غلام حیدر کے جانے کا بندوبست کیا جائے۔' پیر صاحب نے دلیر خان کو کہا۔

'وہ پیر کا روز تھا جب میں درگاہ پہ گیا۔۔۔اب میں درگاہ سے منسوب تھا۔پیر صاحب نے خود مجھے درگاہ سے منسوب کیا۔مجھے یاد تھا کہ آج پیر ہے۔بی بی صاحبہ آئیں گی۔

سارے انتظامات تھے۔آج بی بی صاحبہ نے لنگر خود اپنے ہاتھ سے تقسیم کرنا تھا۔میں بڑے پیر کی قبر کے دائیں جانب والے حُجرے میں ہوتا تھا۔لنگر کا انتظام میرے ذمے تھا۔میرے نصیب جاگے۔۔۔بی بی صاحبہ نے مجھے یاد فرمایا۔۔۔میں گیا۔۔۔۔حجرا پہلی بار دیکھ رہا تھا۔بڑا سا کمرہ۔۔۔اور اس میں بھی سفید رنگ کا پردہ تھا۔بی بی صاحبہ پردے کے اس پار بیٹھی تھیں۔چاہ کے بھی نگاہیں نہ اُٹھا سکا۔مجھے معلوم تھا پہلے حویلی میں میری خوبصورتی کے چرچے تھے اور اب درگاہ میں بھی۔۔۔لوگ کہتے تھے بڑا حسین اور جوان مزارعہ ہے۔نہ جانے کیا غم ہے جو درگاہ کی چوکھٹ سے لگ بیٹھا۔۔۔۔یہ تو میں ہی

جانتا تھا کہ غم ہے یا خوشی۔۔۔اعزاز ہے یا سزا۔۔۔۔ضروری نہیں غم ہی درگاہ پہ کھینچ لائے۔۔۔اعزاز بھی لاتا ہے۔۔۔تو بتا۔۔غم لایا یا اعزاز۔۔۔'

مشراز۔۔۔حیرت سے بابا چراغ دین کو دیکھ رہا تھا۔عمر ڈھلنے کے باوجود۔۔۔ بابا واقعی خوبصورت تھا۔۔وہ خوبصورتی تھی یا چہرے کا نور۔۔۔معلوم نہیں۔۔۔۔

'بول نہ۔۔۔کہاں گم ہے؟؟' بابا چراغ دین نے کہا۔

پھر بابا ہنسنے لگا۔۔۔عشق ایسے ہی گھگھی باندھ دیتا ہے۔۔۔

'میرے اور بی بی جی میں حیا کا پردہ تھا۔سفید چادر تو کچھ نہ تھی۔مرد عورت کو سات دیواری میں سے بھی جھانک لیتا ہے۔ایسی نظر ہے مرد کی۔پر جب حیا ہوناں۔تو کوئی پردہ نہ بھی حائل ہو۔۔۔حیا خود ایک پردہ بن جاتی۔میں کمی کمین بی بی جی کے سامنے کھڑا تھا۔۔۔حیا کی چادر تنی تھی۔'

بابا چراغ دین رونے لگا۔اس کی آنسو بہنے لگے۔۔۔وہ ہچکیاں لینے لگا۔

'حیا کی چادر۔۔۔۔!!!'

....

لاہور

'کیا ہوا۔۔۔جب سے آئے ہو ایسے ہی ہو۔' نازلی نے پوچھا۔

'کچھ بھی نہیں۔' اس نے جواب دیا۔

'پیپر کیسا ہوا؟' نازلی نے پوچھا۔

'بہت اچھا۔' مشراز نے بتایا۔

'پاپا کہہ رہے تھے کہ جاب کی ضرورت نہیں۔میں کھوٹہ جاؤں اور ان کے ساتھ بزنس جوائن کروں۔' نازلی نے کہا۔

'تم کیا کہتے ہو؟'

'ٹھیک کہتے ہیں پاپا تمہارے۔'مشراز نے کہا۔

'میں واپس چلی جاؤں گی مشراز۔۔۔'نازلی نے کہا۔

'ظاہری بات ہے۔۔۔ ہم صرف پڑھنے آئے ہیں یہاں۔۔۔ رہنے تو نہیں۔۔۔'مشراز نے کہا۔

'جلی کٹی نہ سنایا کرو ہر وقت۔۔۔'نازلی نے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

'ہوا کیا ہے۔۔۔؟'اس نے پھر سے پوچھا۔

'اس سوال کے علاوہ کوئی سوال ہے تمہارے پاس؟'مشراز نے پوچھا۔

'ہاں۔۔۔'نازلی نے کہا۔

'کیا تم اپنا موڈ ٹھیک کر سکتے ہو۔۔۔؟'نازلی نے پوچھا۔

'نہیں۔۔۔۔'مشراز نے جواب دیا اور اٹھ گیا۔

'How Rude۔'وہ اس کے پیچھے بھاگنے لگی۔

'تمہارا مسئلہ کیا ہے۔۔۔ میں کب سے تم سے بات کئے جا رہی ہوں اور تم سر پہ چڑھ رہے ہو۔'نازلی نے کہا۔

'I am sorry، وہاں بیٹھتے ہیں۔۔۔ اس درخت کے نیچے۔۔۔۔'مشراز نے کہا۔

'چلو۔۔۔۔'نازلی نے کہا۔

'اب فرماؤ کس الجھن کا شکار ہو؟'نازلی نے پوچھا۔

'کچھ۔۔۔۔۔۔'مشراز کچھ کہنے لگا۔

'اب کچھ نہیں کہا تو میں پتھر تمہارے سر میں دے ماروں گی۔'نازلی نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔۔۔

'شکر ہے۔۔۔تم ہنسے تو۔۔۔۔' نازلی نے کہا۔

'اب بتاؤ۔۔۔' نازلی نے پوچھا۔

'تمہارے نزدیک خوبصورتی کیا ہے؟' مشراز نے پوچھا۔

'تم۔۔۔' اس نے دل میں کہا۔۔۔کاش کہ تمہارے منہ پہ بھی بے باک ہو کے کہہ سکوں۔۔۔

'قیس کی آنکھوں سے لیلیٰ کو دیکھو گے تب جا کے خوبصورتی کا مطلب سمجھ آئے گا۔محبوب کی آنکھوں سے محب کو دیکھو تو تب معلوم ہو گا خوبصورتی کیا ہے۔خوبصورتی کی کوئی تعریف نہیں۔۔۔دیکھنے والے کی آنکھ میں ہے۔۔۔کس پہ نظر ٹکے جا کے۔۔۔'

'اور محبت؟؟؟' مشراز نے پوچھا۔

'کسی کا ہر ستم۔۔۔تحفہ سمجھ کے قبول کرنا۔۔۔' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

'میں سنجیدہ ہوں نازلی۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'تو سنو۔۔۔جتنا گُڑ ڈالو گے اتنا میٹھا ہو گا۔۔۔محبت کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔بس ایک جذبہ۔۔۔ایک احساس۔۔۔جس میں شدت ایک motivational force کا کردار ادا کر رہی ہے۔محبت تو چھوٹی سی شے ہے۔چھوٹی سی بُوٹی، آہستہ آہستہ پروان چڑھتی ہے۔محبت میں شدت بدلتی رہتی ہے۔ہاں مگر جب محبت حد سے بڑھ جائے تو پھر محبت بہت دُور رہ جاتی ہے۔بس شدت بچتی ہے۔تب جو مزہ ہوتا ہے وہ محبت کا تھوڑی ہوتا، وہ لذت محبت کے دیئے گئے تحفے کی ہوتی ہے۔کچھ لوگ تو محبت کرتے ہی اس لئے ہیں کہ شدت کی لذت کو محسوس کر سکیں۔۔۔۔۔تم بتاؤ۔۔۔کتنا گڑ ڈالا ہے؟'

وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔خاموش نظروں سے۔۔۔کیونکہ وہ اپنا مستقبل جان چکی تھی۔

....

'بعض اوقات ہم سمجھتے ہیں کہ زندگی ایک گاڑی ہے اور وہ گاڑی ہم چلا رہے ہیں۔ درحقیقت ایسا نہیں ہوتا۔ ہم مسافر کا کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں۔ ہم مختلف گاڑیوں پر سوار ہوتے جاتے ہیں۔ وہ گاڑیاں ہمیں ہمارے سٹاپ پہ پہنچاتی جاتی ہیں اور پھر ہماری منزل پر اتار کر آگے چلی جاتی ہیں۔ جس کا جتنا سفر ہوا اتنا ہی رہتا ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے میرا اور تمہارا سفر اتنا ہی تھا۔' نازلی نے خود سے کہا۔

کھڑکی سے باہر نظارہ آج بھی ویسا تھا۔ اس کے لان کا سبزہ۔۔۔۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو تھی۔۔۔ مور بھی تھا۔۔۔۔ جو اپنے پنکھ پھیلائے خوشی سے جھوم رہا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ کافی کا مگ ہاتھ میں تھامے وہ لسی کی ٹھنڈک محسوس کر رہی تھی۔ وہ ہنس رہی تھی اپنی بے بسی پہ۔۔۔۔

آج میں پہلی بار تمہارے ساتھ بیٹھی۔۔۔ فاطمہ نے تو ایسے دیکھا کہ جیسے کوئی کفر کر دیا ہو۔ فتویٰ لگانے ہی والی تھی کہ میں نے نظر انداز کیا۔ تمہارے لئے کتنے دوستوں کو چھوڑا ہے میں نے۔ صرف تمہیں دوست بنانے کے لئے۔ ماہین کا کمنٹ بھی یاد ہے۔ کہنے لگی۔۔۔ 'اچھے لگ رہے تھے دونوں ساتھ بیٹھے'۔ رابعہ نے کہا، 'کالج کا مشہور کپل بنتے جا رہے ہو' مجھے پراوہ نہیں۔ بس تمہاری توجہ حاصل رہے۔ تمہاری محبت حاصل رہے۔۔۔ سب سے لڑوں گی میں۔۔۔ کوئی پرواہ نہیں باقیوں کی مجھے۔

سر شکیل نے ایک دم چونک کے دیکھا پھر مسکرائے اور اگنور کیا۔ میں سر کی مسکراہٹ بھانپ گئی تھی۔ مجھے Good Luck کہہ رہے تھے۔ میں نے ایک قہقہہ لگایا، ایسے جیسے تمہیں جیت لیا ہو، جیسے کوئی کھیل جیتنے کے بعد دوسروں کو حقارت سے دیکھ کر ہنسے۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں سے کہے کہ آکر فتح میری ہوئی۔ مگر وہ فتح نہیں تھا۔ تمہارے ساتھ گزرا ہر لمحہ اور لوگوں کا رشک، میں محبت کو کھیل سمجھ بیٹھی۔ بالکل ایک بازی!!

اگلی بار سر شکیل ملے تو بتاؤں گی کہ کھیل ہی تھا جو بس اسی وقت ختم ہو گیا۔

جمشید نے کہا، 'کسی کی دعا لگی ہے تمہیں۔۔۔۔' میں ہنسنے لگی۔۔۔کیا واقعی اس کے ساتھ بیٹھنا کچھ ایسا تھا کہ سب محسوس کریں اور کچھ نہ کچھ کہیں۔دعا تو واقعی کسی کی لگی تھی جو یہ شرف نصیب ہوا۔اب پورا ڈیڑھ سال ہو گیا۔کچھ بھی نہیں بدلا۔۔۔تب بھی مجھے محبت تھی۔آج بھی مجھے ہی محبت ہے۔۔۔تم نے تب بھی دوست ہی سمجھا تھا اور آج بھی دوست ہی سمجھتے ہو۔۔۔۔فرق شاید وقت کا ہے۔وہ فرق تو ازل سے ہے۔جب وقت ایک سا نہیں رہتا تو حالات ایک سے کیوں رہیں۔۔۔۔

....

سرگودھا (رسول آباد)

'سن۔۔۔رانو۔۔۔۔تیری مہرو باجی نے کب آنا ہے؟؟' شہزادی نے کہا۔

'شاید کل آئیں۔۔۔' رانو نے جواب دیا۔

اور وہ تیرا منگیتر؟؟ شہزادی نے پوچھا

'وہ۔۔۔پتہ نہیں۔۔۔' رانو نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

'پتہ ہے وہ مس رضیہ کی بھانجی نہیں ہے۔۔۔بڑا جل رہی تھی تجھ سے۔۔۔' شہزادی نے کہا۔

'جلے۔۔۔۔مجھے تو خوشی ہوگی۔۔۔۔میں بھی اتنی حسین وہ بھی ایسا کہ نظر نہ ہٹے۔۔۔۔لوگ تو جلیں گے۔' رانو نے کہا۔

'تیری منگنی کیا بچپن میں ہوئی تھی؟' شہزادی نے پوچھا۔

'نہیں تو۔۔۔۔بس اماں کا ارادہ ہے۔شیرو کا بھی اور خالہ کا بھی۔۔۔سو سمجھو منگنی ہو گئی۔' رانو نے کہا۔

'وہ تو تجھے گھاس بھی نہیں ڈالتا۔' شہزادی نے کہا۔

'جل مت۔۔۔تجھے بھی جلن ہورہی ہے؟' رانو نے پوچھا۔

سردیوں کی دھوپ تھی۔ کوئی چھت پر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا کوئی صحن میں۔۔۔وہ دونوں چھت پر محوِ گفتگو تھیں۔

'جھوٹ نہیں بول رہی۔۔۔تیری قسم۔۔۔' شہزادی نے کہا۔

'پٹے گی کیا مرے سے؟' رانو نے پوچھا۔

'مہرو باجی کے آگے پیچھے پھرتا تھا وہ۔۔۔اور۔۔۔جس دن تو مجھے چھت پر کھڑا ہونے کو کہہ کے گئی۔۔۔تب بھی وہ ان سے کچھ کہہ رہا تھا۔۔۔' شہزادی نے کہا۔

'میں جانتی ہوں۔۔۔تو بھی باقیوں کی طرح جل گئی ہے۔ میں جا رہی ہوں نیچے۔۔۔بہت کام ہے مجھے۔۔۔ویسے بھی کل مہرو باجی نے آنا ہے۔۔' رانو نے کہا اور چلی گئی۔

'سن تو رانو۔۔۔' شہزادی نے روکنے کی کوشش کی مگر نہ رکی۔

'رانو۔۔۔اری او رانو۔۔۔آ بھی جا نیچے کہ سارا دن اوپر چڑھی رہے گی۔' رانو کی اماں نے آواز دی۔

'آ گئی ہوں اماں۔۔۔' رانو نے کہا۔

'خیر ہو۔۔۔آج تو آدھی آواز پہ ہی نیچے اتر آئی۔۔۔' رانو کی ماں نے کہا۔

'آپ بتائیں کیوں بلایا' رانو نے پوچھا۔

'وہ رانو اور نوید آرہے ہیں۔ میرا ہاتھ بٹا ذرا۔

'انہوں نے تو کل نہیں آنا تھا؟' رانو نے پوچھا۔

'ہاں پر اب آج آرہے ہیں۔۔۔وہ منشیوں کا بیٹا آیا تھا بتانے۔ ان کے گھر فون آیا تھا۔۔۔ہمارا تو فون ہی کٹ گیا۔۔۔اللہ جانے کب ٹھیک ہوگا' اس کی ماں نے کہا۔

....

گوکھووال (فیصل آباد)

'یار شیرو۔۔۔بڑا بدل گیا ہے تو۔۔۔۔۔۔۔پورے چھ ماہ بعد گاؤں آیا ہے۔۔ گیا بھی بغیر بتائے تھا۔اب کیا کہیں تجھے۔۔۔'رفیق نے کہا۔

'کہاں بدلا ہوں۔ویسا ہی ہوں۔'مشراز نے کہا۔

'بتا پھر کیسے آنا ہوا؟' بھولے نے پوچھا۔

'یار اب شرمندہ تو نہ کرو۔۔۔ میرا اپنا گاؤں ہے۔تم لوگ میرے یار ہو۔'مشراز نے کہا۔

'اب تو کھو (کنواں) بھی دہائیاں دے رہا تھا کہ شیرا نہیں آیا۔ جہاں سے گزرتے تھے سب پوچھتے تھے کہ تم لوگوں کا یار نہیں آیا۔۔شہر کی ہوا لگ گئی ہے۔کس کس کو جواب دیتے۔'بھولے نے کہا۔

'لوگ تو باتیں کرتے ہیں۔۔۔نہ کیا کر پرواہ۔۔۔'مشراز نے کہا۔

'سائیں جھلا ہو گیا ہے۔۔۔ پہلے تھوڑا تھا۔۔۔ اب پورا۔۔۔'سب دوستوں نے قہقہہ لگایا۔

'کس کی بات کرر ہے ہو؟؟'مشراز نے پوچھا۔

'ایک دن تایا خیر محمد کی بہو گزری دربار کے پاس سے۔۔۔۔بابا بڑے طیش میں تھا۔۔۔۔کہنے لگا۔۔۔حیا کی چادر۔۔۔۔حیا کی چادر۔۔۔۔'وہ ہنسنے لگے۔

'شرم کرو یار۔۔۔بابا چراغ دین کا مذاق اُڑا رہے ہو۔'مشراز نے کہا۔

'مذاق کہاں اُڑایا۔۔۔حقیقت بتائی۔۔۔۔'رفیق نے کہا۔

'محبت جب حد سے بڑھ جائے ناں۔۔۔تو۔۔۔۔'مشراز نے کہا۔

'ہاں اب کہہ دو کہ عشق کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔۔۔'رفیق نے کہا اور ہنسنے

لگا۔۔۔

'نہ نہ۔۔۔۔عشق تو ہے ہی ایک الگ سمت۔۔۔۔عشق ایک بیل ہے ایک پودا ہے جو چمٹ جائے ناں تو بس۔۔۔انسان گیا۔۔۔یا تو بڑے بڑے کام کرتا ہے یا پھر کسی کام کا نہیں رہتا۔۔۔لوگ کہتے ہیں کہ بابا چراغ دین، فقیر ہے، سائیں ہے، اس نے چلے کاٹے، بیعت لی اور پتہ نہیں کیا کیا۔لیکن تجھے سچ بتاؤں۔۔۔بابا کچھ بھی نہیں، بابا بس پہنچا ہوا عاشق ہے۔عشق کا پودا ایسا چمٹا کہ بس بابا ہو جو گا ہی رہ گیا۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'جس تن لاگے وہ تن جانے!!!' مشراز نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

کنویں کی ایک طرف ٹیوب ویل تھا۔۔۔۔سامنے کھیت ہی کھیت۔۔۔۔شام ہو چکی تھی۔۔سردی اپنے عروج پر تھی۔وہ آگ جلائے ایک طرف بیٹھے تھے۔آگ کی روشنی تھی اور دوسرا چاندکی۔۔۔۔

'دیکھ۔۔۔۔آج چاند پورا ہے۔۔۔۔' رفیق نے کہا۔

'اکیلا بھی۔۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'واہ۔۔۔شیرو۔۔۔۔کیا عاشقانہ بات کی ہے۔' رفیق نے کہا۔

'پورا چاند گول ہوتا ہے۔۔۔۔ روشن ہوتا ہے۔ خوبصورت ہوتا ہے۔ مگر دیکھ۔۔۔پھر بھی نامکمل لگتا ہے۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'تبھی تجھے پہلی کا چاند پسند ہے۔' رفیق نے کہا۔

'اس کے ساتھ ایک اُمید بندھی ہوتی ہے کہ وہ پورا ضرور ہوگا۔لیکن پورے کے ساتھ کیسے امید باندھیں کہ مکمل بھی ہوگا۔ایک خلش پھر بھی رہ جاتی ہے۔خلش جتنی اذیت دیتی ہے نہ۔۔۔اور کچھ اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا۔' مشراز نے کہا۔

وہ پورے چاند کو دیکھ رہا تھا۔۔۔۔اور سوچ رہا تھا۔۔۔۔دیکھیں یہ چاند کبھی

میں آپ کے ساتھ دیکھا کرتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے آپ ہی سے بے انتہا محبت ہو جائے گی۔۔محبت کا وقت غلط تھا یا آپ کا اور میرا تعلق۔۔۔معلوم نہیں۔۔۔مگر آج بھی آپ کی خوشیوں کی دعا دل سے کرتا ہوں۔ایک تنگی سی رہ گئی کہ کاش 'قبول ہے' بھی سن لیتا۔۔سن لیتا تو خود بھی قبول کر لیتا کہ ہر محبت کا انجام حاصل نہیں ہوتا۔لا حاصل محبت بھی ایک اہم حقیقت ہے۔۔۔جس سے انکار ممکن نہیں۔۔۔۔

....

بابا چراغ دین

'حیا کی چادر۔۔۔طوق ہے یا اعزاز؟؟'مشراز نے پوچھا۔

بابا چراغ دین نے قہقہہ لگایا۔۔۔'تجھے کیا لگا؟؟'

'معلوم نہیں۔۔۔۔تبھی تو پوچھا۔۔۔'مشراز نے جواب دیا۔

'سچے عاشقوں کے لئے یہ چادر ہے۔۔۔ چادر کیا کرتی ہے؟ ڈھانپتی ہے۔۔۔پردہ رکھتی ہے۔۔۔بے پردگی سے بچاتی ہے۔۔۔ ڈھارس بندھاتی ہے۔۔۔ چھپاتی ہے۔۔۔ سچے عاشق اسی کو ڈھال سمجھتے۔۔۔۔یہ جو دل ہاتھ میں لئے محبت کے دعوے کرتے، ہوس کے پجاری۔۔۔ان کے لئے طوق ہے۔۔۔دیوی کا سمان اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھے رہنے سے ہی ہے۔۔۔رب کی شان۔۔۔اس کے سامنے زمین بوس ہونے سے ہی ہے۔۔۔۔ایک محبوب کا اعزاز عاشق کا اس کے سامنے سر جھکا رہنے سے ہی ہے۔

آہ۔۔۔حیا کی چادر۔۔۔

یہ جو داستان محبت ہوتی ہے ناں۔۔۔حیا کی چادر سے ہی اس کی تکمیل ہوتی ہے۔حیا کی چادر۔۔۔۔اس کو دیر پا رکھتی ہے۔۔۔

بی بی صاحبہ نے مجھ سے انتظامات کا پوچھا۔ میں نے بتایا۔۔۔ پیرو مرشد میری سات پشتیں پیروں پہ قربان۔۔۔ کوئی کوتاہی نہیں ہو گی۔۔۔۔

ان کا دھیما لہجہ، آواز کی شائستگی۔۔۔۔ وہ سرور تھا کہ مدہوش کر دے۔ جینے کی خواہش جگا دے یا ایسا کرے کہ آپ اس کے بعد کوئی آواز نہ سُننا چاہیں۔ میں چاہ کے بھی نظریں نہ اٹھا پایا۔ میرے کانوں میں اب بھی وہ آواز گونجتی ہے۔۔۔'

بابا چراغ دین رونے لگا۔۔۔ کانوں پہ ہاتھ رکھ کے۔۔۔ ہچکیاں بھرنے لگا۔ 'میں نہیں بھلا سکتا۔'

'پہلا پیار بھلایا نہیں جا سکتا بابا۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'اور نہ ہو جھلیا۔۔۔۔ پیارو یار کچھ نہیں ہوتا۔۔۔ دنیا کے کھیڈ ہے سارے۔۔۔ کھیل تماشے۔۔۔ کھیلو اور کھیلتے جاؤ۔۔۔۔

رب سائیں عشق نازل کرتا ہے۔۔۔ وحی کی طرح۔۔۔۔ عشق پہلا اور آخری تو نہیں ہوتا۔۔۔ ازل سے ابد تک ایک ہی ہوتا ہے صرف ایک۔۔۔ عشق پیچہ بوٹی۔۔۔ ایک بوٹی ہے۔۔۔ چمٹ جاتی ہے۔۔۔ جان تب چھوڑتی ہے جب جان جاتی ہے۔۔۔'

'یہ عشق ہے یا محبت۔۔۔' مشراز نے خود سے سوال کیا۔

'بڑی خوبصورت درگاہ تھی۔ کھلی۔۔۔ صاف ستھری۔۔۔ خوشبودار۔۔۔ ہوا دار۔۔۔ حُجرے تھے اتنے۔۔۔۔ کئی مزارعے کمی کمین تھے۔ کمی کمین نہیں سمجھتے تھے انہیں۔ بڑا نصیب والا سمجھتے تھے۔ سرکار کی خدمت میں جو تھے۔

کئی جوڑے آتے تھے اپنی آس کا دیا جلانے۔۔۔ کئی اپنی جھولیاں پھیلائے درخت کے نیچے بیٹھے رہتے۔۔۔ کئی خواتین اپنی چادریں بچھا جاتیں۔۔۔۔ گر پتہ گرا تو مراد بر آئے گی۔ نہ گرا تو اللہ کی مرضی۔۔۔ ہوا کے رُخ پہ تھی ساری منت۔۔۔ ہوا بھی تو رب سوہنے نے اپنی مرضی سے چلانی تھی ناں۔۔۔ پاس ہی بہت بڑا دریا ہوتا تھا۔۔۔

بہت بڑا۔۔۔۔

میں شام کو جاتا۔۔۔ دریا کے کنارے بیٹھتا۔۔۔ پانی سے باتیں کرتا رہتا۔۔۔۔

ایک دن بیٹھا تھا۔۔۔ بی بی صاحبہ کا عکس دکھا پانی میں۔۔۔۔ میں نے دیکھا پھر مسکرایا۔۔۔ سفید چادر اسی طرح اوڑھی ہوئی تھی۔۔۔ سر سے لے کر پیروں تک ڈھکی ہوئی حیا کی چادر۔۔۔۔

چہرہ ہونٹوں تک ڈھکا تھا۔۔۔ ہاتھوں سے چادر تھام رکھی تھی۔ میں مسکرایا۔۔۔ یکدم خیال آیا۔۔۔ نہ۔۔۔۔نہ غلام حیدر۔۔۔نہ۔۔۔ امانت میں خیانت نہیں کرتے۔۔۔۔میں نے آنکھیں زور سے بند کرلیں۔۔۔۔'

....

سرگودھا (رسول آباد)

'آ گئیں۔۔۔۔مہرو باجی۔۔۔۔آپ۔۔۔۔' رانو بھاگتی ہوئی آئی۔۔۔

'نوید بھائی کیسے ہیں آپ۔۔۔' رانو نے پوچھا۔

'جیسا بھی ہوں۔۔۔تم جیسا پیارا نہیں ہوں۔۔۔' نوید نے کہا۔

'کیسی ہیں خالہ آپ۔۔۔۔؟' مہرو نے اندر آتے ہوئے کہا۔

'بالکل ٹھیک میری بیٹی۔۔۔ شکر ہے تم آ ئیں۔۔۔ بہت دل اداس ہو رہا تھا۔' خالہ نے کہا۔

'یہ تو آ ہی نہیں رہی تھی، میں نے کہا کل بھی تو جانا ہے۔۔۔ آج ہی ہو آؤ پھر دو دن بعد لے آؤں گا۔۔۔' نوید نے کہا۔

'اچھا کیا بیٹا۔۔۔تم سناؤ گھر میں سب ٹھیک ہے؟' خالہ نے پوچھا۔

'ہاں جی اللہ کا کرم ہے۔۔۔بس گاڑی میں لایا ہوں مہرو کو۔۔۔۔ یہ سوٹ بھی بہت مہنگا دلا یا ہے۔۔۔اس نے تو عام سا پہنا تھا جو آپ نے جہیز میں دیا تھا۔۔۔' نوید نے کہا۔

خالہ کوئی جواب نہ دے سکی۔۔۔

'ارے ہم نے بھی بڑے مہنگے مہنگے جوڑے دیے۔۔۔ وہ کالا والا پہنتی ناں۔۔۔وہ تو شیرولا یا تھا۔۔۔لاہور شہر سے۔۔۔اچھے والا جوڑا' رانو نے کہا۔

'چپ کر بھائی کے آگے سے نہیں بولتے' خالہ نے کہا۔

'نہیں خالہ۔۔۔۔یہ تو دوست ہے میری۔' نوید نے کہا۔

'بس سن لیا اماں۔' رانو اترانے لگی۔

'چل آ میرے ساتھ۔۔۔ہاتھ بٹا میرا۔' خالہ نے کہا۔

رانو اٹھنے لگی۔نوید نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

'خالہ! ابھی تو میں چلا جاؤں گا۔رانو کو یہی بیٹھے رہنے دیں۔مہرو تم جاؤ۔خالہ کا ہاتھ بٹاؤ۔' نوید نے کہا۔

'نہیں نہیں۔۔۔مہرو مہمان ہے۔' خالہ نے کہا

'پہلے بھی تو یہی کام کاج کرتی تھی۔۔۔اب بھی کر لے گی۔' نوید نے کہا۔

'بیٹیوں نے ہی کرنا ہوتا ہے۔۔۔مہرو تو بیٹوں سے بڑھ کر ہے۔' خالہ نے کہا۔

'خالہ۔۔۔آپ بیٹھ جایئے۔۔۔بس مجھے بتا دیں کیا کرنا ہے۔' مہرو نے کہا۔

'میں بھی ساتھ ہی چلتی ہوں بیٹا' خالہ نے کہا۔

رانو اور نوید خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

مہرو چولہے کے سامنے کھانا گرم کرنے میں مصروف تھی اور خالہ روٹیاں بنا رہی تھیں۔

نوید سے نظر بچا کر پوچھا۔۔۔'مہرو بیٹی۔۔۔تو خوش تو ہے ناں؟'

'ہاں خالہ۔۔۔بہت خوش ہوں۔۔۔'مہرو نے جواب دیا۔۔۔

خالہ کو خاموش پا کر کہنے لگی۔۔۔۔'خالہ آپ ان کی باتوں کی فکر نہ کریں۔۔۔یہ بس ایسے ہی بول دیتے ہیں۔'مہرو نے کہا

'اور اس کی بیٹی۔؟' خالہ نے پوچھا۔

'میرے پاس ہی ہوتی ہے خالہ۔۔۔بہت پیاری بچی ہے۔۔۔'مہرو نے کہا۔

مہرو اور خالہ کو باتیں کرتا دیکھ کر نوید اُٹھ کھڑا ہوا۔۔۔

کرسی سے اٹھ کر چولہے کے قریب آیا۔

'ہاں جی۔۔۔خالہ بھتیجی میں کیا گپ شپ چل رہی ہے۔'نوید نے کہا۔

'کچھ نہیں۔۔۔کھانا تیار ہے۔میں لاتی ہوں آپ بیٹھیں۔'مہرو نے کہا۔

'رانو۔۔۔۔ادھر آؤ۔۔۔یہ کھانا لگاؤ۔۔۔'مہرو نے رانو کو آواز دی۔

'آئی مہرو باجی۔۔۔'رانو نے کہا اور برتن لگانے لگی۔

....

گوکھووال (فیصل آباد)

رانو کے امتحان ہونے والے ہیں۔مہرو کی شادی پہ کہہ آئی تھی میں کہ امتحان کے بعد رسم کرنے آؤں گی۔۔۔شیرو کی ماں نے کہا۔سامنے موڑھے پر ایک مٹی کے برتن میں ساگ پڑا تھا اور ڈھیر سارا مکھن۔ساتھ دیسی گھی کی روٹی تھی اور زمین پر لسی کا جگ پڑا تھا۔مٹی سے لیپ ہوئی زمین تھی۔سامنے ایک بڑا سا کمرہ تھا جس کے اندر دو مزید کمرے تھے۔کمروں کے دائیں جانب مٹی اور گارے کی بنی سیڑھیاں تھیں جن کا راستہ چھت کی طرف جاتا تھا۔کونے میں دو غسل خانے تھے اور سامنے دیوار کی طرف ایک بڑا سا صحن تھا

جس میں نلکا لگا تھا۔ جو کپڑے اور برتن دھونے کا کام آتا تھا۔

مشراز نے اگلا نوالا منہ میں ڈالا اور لسی گلاس میں ڈالنے لگا۔

'میں نے تجھے بتایا شیرو۔۔۔' ماں نے کہا۔

'آپ کو بتا چکا ہوں اماں۔۔۔ مجھے مجبور مت کریں۔ میں یہ شادی نہیں کرسکتا۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'یہ صلہ دے رہا ہے اکیلی ماں کو۔۔۔' ماں نے کہا۔

'آپ پہلے گڑیا کی شادی کریں۔۔۔۔ پھر اس کے بعد دیکھیں گے۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'ہاں گڑیا کی شادی کردوں اور گھر خالی کرلوں۔۔۔ پہلی تیری کر کے رانو کو یہاں لاؤں گی۔۔۔ پھر اس کی کروں گی۔۔۔' ماں نے کہا۔

'میں ابھی نہیں کرسکتا۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'میں زبان دے آئی ہوں۔۔' ماں نے کہا۔

'آپ نے اب کی بار ضد کی تو میں واپس کبھی نہیں آؤں گا۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'اب کی بار۔۔۔ پہلے تو اپنی فرمائش دیکھتا۔۔۔ کہاں جوڑ تھا۔۔۔ تیرا اور اس کا۔۔۔ کسی طرح سے نہیں تھا۔۔۔ نہ شکل نہ صورت۔۔۔ عمر میں اتنی بڑی اور رشتہ۔۔۔ توبہ کر شیرو۔۔۔ کیا ہوگیا ہے۔۔۔۔ اور اس کی شادی سے کچھ دن پہلے۔۔۔' ماں نے کہا۔

'جواز تھا۔۔۔۔ سیدھا سادھا جواز۔۔۔ وہ خوش نہیں تھیں۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'میں نے کہہ دیا سو کہہ دیا۔۔۔۔ رانو ہی اس گھر کی بہو بن کے آئے گی۔' ماں نے اعلان کیا۔

....

سرگودھا (رسول آباد)

’نوید تیرے ساتھ ٹھیک ہے ناں؟‘ خالہ نے پوچھا۔

’ہاں خالہ آپ فکرمند نہ ہوں؟‘ مہرو نے کہا۔

’لینے کب آئے گا؟‘ خالہ نے پوچھا

’کچھ کہہ نہیں سکتی۔۔۔۔جی میں آئے تو شام کو ہی آجائیں۔‘ مہرو نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

’آپ کی لڑائی کتنی بار ہوئی ہے اب تک؟‘ رانو نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

’نہیں۔۔۔کوئی خاص نہیں۔۔۔‘ وہ مسکرانے لگی۔

’عام ہی بتادیں۔۔۔‘ رانو نے کہا۔

’مشراز کہتا ہے کہ جھگڑے پیار کی علامت ہوتے ہیں۔‘ رانو نے کہا۔

خالہ ہنسنے لگیں۔۔۔۔

’یہ کب فرمایا اس نے آپ سے۔۔۔‘ مہرو نے رانو کا کان پکڑتے ہوئے کہا۔

آہ۔۔۔آہ۔۔۔ وہ ہنسنے لگی۔۔۔’مہرو باجی بہت زور سے کان کھینچتی ہیں آپ۔۔۔میں بھی کہوں نوید بھائی کے کان اتنے لمبے کیوں ہیں۔‘ وہ یہ کہہ کر دروازے کی طرف بھاگی۔

مشراز اندر داخل ہورہا تھا۔وہ دونوں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

’جی آیاں نوں۔۔۔میرا پتر آیا۔۔۔آجا شیرو۔۔۔ابھی تیرا ہی ذکر کیا۔۔۔‘ خالہ نے کہا۔

’کمال ہے خالہ۔‘ مشراز نے خالہ کے آگے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

’سوسال عمر پائے تو۔۔۔‘ خالہ نے کہا

'چھوٹی کیسی ہے؟' مشراز نے رانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

'رانو شکلیں بنانے لگی۔ سامنے ہی ہوں اور زندہ ہوں۔' اس نے کہا۔

'جگ جگ جیئو۔۔ ہزار سال عمر پاؤ۔۔۔' مشراز ہنسنے لگا۔

'آپ کیسی ہیں۔۔۔؟' اس نے مہرو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

'اللہ کا کرم۔' اس کی آواز کی سادگی۔۔۔ اس کا خاموش چہرہ۔۔۔ سوالیہ آنکھیں۔۔۔ دونوں کلائیوں میں چوڑیاں ہونے کے باوجود سوُنی تھیں۔۔۔ چوڑیوں کے نیچے کہیں۔۔۔ سرخ رنگ کا نشان تھا جیسے کوئی زخم ہو۔۔۔ وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔

'کیا ہوگیا؟ کیوں سٹی گم ہوگئی؟ ابھی تو میں نے کچھ کہا بھی نہیں۔' رانو نے ہنستے ہوئے کہا۔

'جاؤ پانی لاؤ میرے لئے۔' اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

'جاؤ وہ تھکا ہوا آیا ہے۔۔۔ پھر چائے میں آ کر بناتی ہوں۔۔۔' خالہ نے کہا۔

'کیا ہوا؟' مہرو نے پوچھا۔

'اور بھی کچھ ہونا تھا۔' اس نے مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

'کیا مطلب؟' مہرو نے جواب دیا۔

'کچھ نہیں۔ آپ بتائیں۔۔۔ ٹھیک ہیں؟' مشراز نے پوچھا۔

'ہاں۔۔۔' مہرو نے جواب دیا۔

'خوش بھی؟؟' اس نے پوچھا۔

وہ ہنسنے لگی۔ 'خوشی غمی تو زندگی تولنے کا پیمانہ ہے۔' مہرو نے کہا۔

'ہاں تو بتائیے۔ کس کا پلڑا بھاری ہے؟' مشراز نے کہا۔

'تم بتاؤ۔ ڈگری مکمل ہوگئی؟' اس نے پوچھا۔

'جی ہوگئی۔۔۔' اس نے جواب دیا۔

'سلام خالہ۔۔۔'شہزادی چہکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

'کتنی بار کہا آہستہ بولا کر۔۔۔' خالہ ہنسنے لگیں۔

'خالہ! چڑیاں چہکتی اچھی لگتی ہیں۔'شہزادی کہنے لگی۔

'سلام۔۔۔مہرو باجی۔۔۔سلام جی جاجی۔۔۔'شہزادی نے کہا۔

'ارے باولی ہوگئی ہے کیا۔۔۔ یہ شیرو ہے۔۔۔میرا بھانجا۔۔۔' خالہ مسکرانے لگیں۔

'ہاں خالہ۔۔۔جانتی ہوں۔۔۔'وہ رانو کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

'کیا لائی ہے؟' خالہ نے اس کے ہاتھ سے ٹرے پکڑتے ہوئے کہا۔

'گڑ والے چاول۔۔۔'اس نے بتایا۔

'میری پسند کے۔۔۔'رانو نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

'میرے شیرو کو بھی بہت پسند ہیں۔۔۔۔شیرو۔۔۔۔ یہ رانو کی سہیلی ہے۔۔۔ پکی سہیلی۔۔۔بچپن سے ہی ساتھ پلی بڑھی ہیں۔' خالہ نے بتایا۔

'جی خالہ۔۔۔انداز سے ہی جان گیا تھا۔'شیرو نے کہا۔

'کیا مطلب ہے آپ کا؟' رانو نے پوچھا۔

'کچھ نہیں۔۔۔'مشراز نے کہا اور مہرو سے باتیں کرنے لگا۔

'آپ کے شوہر نہیں آئے؟'مشراز نے پوچھا۔

'کیا شوہر نہیں آئے۔۔۔بہنوئی ہے تیرا۔۔۔نوید بھائی کہہ۔۔۔' خالہ ہنسنے لگی۔

'جی خالہ۔۔۔'مشراز نے کہا۔

'بہنوئی بھی نہیں اماں۔۔۔آپ کیا بتاتی ہیں کہ مہرو باجی آپ کی خالہ کی نند بیٹی ہیں۔'رانو نے کہا۔

'ہاں ہے تو صحیح۔۔۔مگر بچپن میں سب کے ساتھ کھیلتے کودتے وہ بھی مجھے خالہ ہی

کہتی رہی۔۔۔۔سو رشتہ خالہ بھانجی کا بن گیا۔۔۔' خالہ ہنسنے لگی۔۔۔

....

اس نے آغاز ہی بہتے آنسوؤں سے کیا اور فیض کا ایک مصرعہ لکھ ڈالا۔۔۔۔

'تیرے عہد میں دل زار کے سبھی اختیار چلے گئے۔'

اور پھر مسکرا دی۔۔۔۔۔' کہاں سے شروع کروں اور کہاں ختم کروں۔۔۔ ایک خط کی طرح لکھوں۔ ایک دھمکی یا ایک چیلنج۔۔۔ جو بھی سمجھو۔۔۔ چلو گزارش کر لیتے ہیں۔نہ تمہیں حکم دیتی اچھی لگوں گی اور نہ چیلنج کرنا مناسب رہے گا کیونکہ جن سے عشق کیا جاتا ہے۔ ان سے مقابلے کا سوچا بھی نہیں جاتا۔ بس ان کی تعظیم میں سر تسلیم خم کیا جاتا ہے اور نظریں غلطی سے بھی نہیں اُٹھائی جاتیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ مجھے یاد کر کے دیکھو۔ چند منٹ، چند پل، کچھ ساعتیں میرے نام کر کے دیکھو۔۔۔ مجھے اس طرح یاد کر کے دیکھو کہ جیسے میں تمہیں ہر لمحہ ہر پل یاد کرتی آئی ہوں۔ صرف ایک بار تھوڑی سی کاوش کر لو۔ کامیاب ہو گئے تو تمہاری قسم اسی پل تمہیں بھول جاؤں گی۔'

وہ ہنسنے لگی۔۔۔ میں بھی کتنی پاگل ہوں۔۔۔ کیا لکھے جا رہی ہوں۔۔۔ یہ وہ خطوط ہیں۔۔۔ جو کبھی بھیجے نہیں جائیں گے۔ یا یوں کہہ لیجیے۔۔۔ وہ خطوط ہیں جن کا بھیجنا ہی ممکن نہیں۔ خیر، ناممکنات پہ یقین رکھنا میرا خاصہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ میں آئیڈیلسٹ ہوں۔ خیالی دنیا میں رہتی ہوں۔ لوگوں کا کیا ہے۔۔۔ کہنے دو۔۔۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں، تم ایک حقیقت ہو۔ وہ ہنسنے لگی۔

وہ دن یاد ہے مجھے، جب میں نے اظہار محبت کرنا چاہا۔۔۔۔ اس نے ڈائری بند کی اور ٹیرس پہ جا کر کھڑی ہوئی۔ وہی درخت تھا جہاں ہم اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ اس دن بھی ہم وہیں تھے۔ ہاں مگر تم دماغی طور پر کہیں اور تھے۔

میں نے کہا، 'مشراز۔۔۔ کیا سوچا مستقبل کے بارے میں۔؟'

'تم کہنے لگے۔۔۔کچھ نہیں۔۔۔'

'شادی کرو گے؟؟'

'تمہارا جواب آیا۔۔۔پتہ نہیں۔۔۔'

'کس سے کرنا چاہو گے؟؟'

'تم نے کہا معلوم نہیں۔۔۔'

'میں تنگ آ گئی تمہارے جوابات سے۔۔۔میں نے فوراً کہہ دیا۔۔۔مجھے نہیں سمجھ آتا۔۔۔میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گی۔۔۔نہ مجھے اظہار محبت آتا ہے۔۔۔تم خود ہی سمجھ جاؤ۔۔۔تم نے بات مکمل ہونے سے پہلے ہی مجھے لاجواب کر دیا۔ اچھا سا لڑکا ڈھونڈ واور شادی کرلو۔۔۔اپنی پسند کا یا ابا کی پسند کا۔۔۔مرضی تمہاری۔۔۔جیسے تمہیں سوٹ کرے۔۔۔تم نے بے باکی سے جواب دیا۔۔۔ایک بار بھی نہ سوچا کہ مجھ پہ کیا گزری ہوگی۔ خاموشی کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ آنکھیں نم تھیں۔۔۔مگر تمہاری Straight forwardness اچھی لگی۔ محبت میں دوہرا معیار کہاں۔۔۔پسند آئے تو دل کے قریب، نہ آئے تو اٹھا کے باہر پھینک دو۔۔۔محبوب کا ہر ستم بھی کرم ہی لگتا ہے۔۔۔محب تو اسیر ہے۔۔۔قید۔۔۔ایک قیدی کی طرح۔۔۔ میں بھی تمہاری محبت میں گرفتار ایک قیدی تھی۔ رہائی ممکن ہی نہ تھی۔ چابی۔۔۔ چابی، تمہاری محبت تھی۔ رہا تم ہی کر سکتے تھے۔

....

سرگودھا (رسول آباد)

'یہاں کیوں کھڑے ہو۔۔۔اندر آ جاؤ۔۔۔۔'مہرو نے کہا۔

'بس دیکھ رہا ہوں۔۔۔ یہ دہلیز پار نہ کر سکا کبھی۔۔۔'مشراز نے جواب

دیا۔۔۔

'کیا ہوا؟' مہرو نے پوچھا۔۔۔۔

'مجھے معاف کر دیں۔۔۔میں کچھ نہ کر سکا۔۔۔۔'مشراز نے کہا۔

'میں وعدہ کر کے گیا تھا۔۔۔مگر۔۔۔۔'مشراز نے مزید کہا۔

'کہانی لکھی جا چکی ہے۔۔۔۔ہم تو بس کردار ہیں۔۔۔۔اداکاری کرتے ہوئے کردار، جو سکرپٹ اپنی مرضی سے نہیں بدل سکتے۔ہونا وہی ہے جو ہمارے مصنف نے لکھ دیا ہے۔غم کیسا، اختیار ہی نہیں جب۔سو جو لکھا جا چکا ہے، ہم تسلیم کر چکے ہیں۔'مہرو نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''آپ کے ہاتھ پر چوٹ کیسی ہے؟'اس نے پوچھا۔۔۔

'یہ۔۔۔۔وہ۔۔۔مہرو نے کچھ کہنا چاہا۔۔۔۔'

'گر پڑی تھی اور چوٹ لگ گئی۔۔۔'ایک مردانہ آواز آئی۔۔۔مشراز نے مڑ کر دیکھا تو ایک درمیانی عمر کا آدمی۔۔۔کلف والا سوٹ پہنے۔۔۔ہاتھ میں سنہرے رنگ کی گھڑی اور بائیں ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی تھی۔

'السلام علیکم۔شہری بابو'اس نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے مشراز کو سلام کیا۔

'وعلیکم السلام۔۔۔۔'مشراز نے کہا۔۔۔۔

'ارے میں نے سنا تھا کہ نوید آ گیا۔۔۔'خالہ بولتی ہوئی آ رہی تھیں۔۔۔

'نوید۔۔۔۔۔۔۔'خالہ نے کہا۔

'سلام خالہ۔۔۔۔'نوید نے کہا۔

'تو نے تو کل آنا تھا۔۔۔'خالہ نے کہا۔

'تو کیا ہوا۔۔۔اپنا گھر ہے۔۔۔آج ہی آ گیا۔۔۔میری دوست کہاں ہیں۔۔۔؟'اس نے سب باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

'وہ۔۔۔وہ۔۔۔۔ رانو۔۔۔باہر ہے۔۔۔' خالہ نے بوکھلائے ہوئے جواب دیا۔۔۔

'آؤ صاحب۔۔۔۔ہم بھی باہر چلیں۔۔۔۔' مشراز کو کہنے لگا۔

'تم جلدی تیار ہو۔۔۔آج ہی جانا ہے۔۔۔' اس نے مہرو کو کہا۔

'کیوں بھئی آج کیوں۔۔۔؟' رانو کی آواز آئی۔

'ارے علشبہ کی طبیعت نہیں ٹھیک۔' نوید نے کہا۔

'علشبہ کے لیئے ہی تو لا یا ہوں اسے، ورنہ مجھے کیا ضرورت، مجھے تو کوئی بھی پندرہ سولہ برس کی لڑکی مل جاتی، پر وہ نادان، لڑکپن میں کہاں ان پہ بوجھ ڈالتا بچی کا۔۔۔' نوید نے ہنستے ہوئے کہا۔

'جی۔۔۔۔ٹھیک۔۔۔۔میں تیار ہوتی ہوں۔' مہرو نے جواب دیا۔۔۔۔

'او۔۔۔رانو۔۔۔۔۔رانو۔۔۔۔' نوید رانو کو بلانے لگا۔

'او۔۔۔۔۔آج تو بڑی پائلیں شائلیں پہن رکھی ہیں۔۔۔' نوید نے کہا۔

رانو ہنسنے لگی۔۔۔'ہاں جیجا جی۔۔۔۔مجھے پسند ہیں۔۔۔' رانو نے جواب دیا۔

مہرو برآمدے میں کھڑی تھی۔ دل ہی دل میں سوچنے لگی۔۔۔ خدا اس کا اگلا سوال یہ نہ ہو۔۔۔۔۔۔وہ آنکھیں بند کیئے زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔ کیا ہوا۔۔۔۔آپ کیوں ایسے سہمی کھڑی ہیں۔۔۔مشراز نے اس کو کاندھوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔۔۔

'یہاں بیٹھ جائیں۔۔۔' وہ کہنے لگا۔۔۔

'چل میں بھی تجھے ڈھیر ساری پازیبیں لا کر دوں گا۔' نوید نے کہا۔

مہرو برآمدے میں بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔

مشراز کچھ کہنے کے لیئے آگے بڑھا مگر مہرو نے ہاتھ بڑھا کر اُسے وہیں روک دیا۔

'جاؤ پلیز۔۔۔' مہرو نے بس اتنا ہی کہا اور اپنے کمرے کی طرف واپس آ گئی۔
مشراز باہر صحن میں آ کر کبھی نوید کو دیکھتا تو کبھی رانو کو۔۔۔

....

مہرو کے کانوں میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔ یہ بس خوبصورت پیروں کا شیدائی ہے۔ پیر دیکھتے ہی کبھی پازیب کی بات کرتا ہے تو کبھی ہیل والی جوتی کی۔

'میں تجھے بہت سی پازیبیں لا کر دوں گا۔۔۔ ہیل والی جوتی بھی۔۔۔۔'

'او دیکھ تو سہی تیری آپا تیار ہوئی کہ نہیں۔۔۔' نوید نے رانو کو کہا۔۔۔

'اس نے کیا تیار ہونا، تیار ہو کے بھی ویسی ہی رہنا، اب ہر کوئی تیرے جیسا خوبصورت تو نہیں۔۔۔'

'بیٹا کھانا کھا کے جانا۔۔۔' خالہ نے کہا۔

'او نہ خالہ۔۔۔ یہاں بھی میری بیگم کے ہاتھ کا ہے۔۔۔ وہاں بھی۔۔۔ میں گھر جا کر کھا لوں گا۔۔۔' نوید نے کہا۔

'نہیں بیٹا۔۔۔ میں نے بنایا ہے۔۔۔ رانو! تو سلاد کاٹ۔۔۔' خالہ کہنے لگی۔

'نہیں خالہ رانو کو میرے پاس ہی بیٹھا رہنے دے۔ تیرے سے نہیں کام ہوتا تو میں گھر جا کے ہی کھا لوں گا۔ ویسے بھی میں ککڑ نہیں کھاتا۔۔۔ بکرا رکھا ہوا ہے گھر میں۔۔۔ پکا لیتے ہیں۔ جب جی کرے۔ ویسے بھی مہرو کو کہاں کچھ بنانا آتا۔۔۔ پہلے والی کو بھی اسی لیے نکالا تھا۔۔۔ کام کاج کا ڈھنگ نہیں تھا' نوید نے کہا۔

'خالہ میں چلتا ہوں۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'اوہ جناب۔۔۔ تسی شہری بابو ہو۔۔۔۔ ہم پینڈوؤں کے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔۔۔ مجھے دیکھتے ہی چل نکلے۔۔۔ خواتین اکیلی تھیں تو آ گئے۔' نوید ہنسنے لگا۔

'یہ میرا بیٹا ہی ہے۔۔۔' خالہ نظریں جھکائے کہنے لگیں۔

'ہاں ہاں مجھے پتہ ہی۔۔۔میں تو مذاق کر رہا تھا۔'نوید نے کہا۔

'چل لگا دے روٹی۔۔۔کچھ کھا پی ہی لیتے ہیں۔۔۔تو بھی بیٹھ جا باؤ۔۔۔'نوید نے کہا۔

بیٹھ جا بیٹا۔۔۔' خالہ نے بجھے ہوئے لہجے میں التجائیاں نظروں سے کہا۔

اتنے میں مہرو کمرے سے نکلی۔۔۔'اٹھو رانو۔۔۔خالہ کا ہاتھ بٹاؤ۔۔۔میں چلی جاؤں گی تو تم ہی نے کرنا ہے سب۔۔۔چلو شاباش۔۔۔جی مہرو باجی۔۔۔جیجا جی میں بس ابھی آئی۔۔۔ورنہ باجی غصے ہوں گی۔'رانو نے ہنستے ہوئے کہا۔

'ہاں ہاں جاؤ۔۔۔پھر آ کر بتانا کس رنگ کا جوتا چاہیے۔'نوید ہنسنے لگا۔

....

اسلام آباد

سردیاں شروع ہوگئی ہیں۔۔۔بوڑھی ہڈیاں ہیں ناں۔۔۔ستمبر آتے ہی۔۔۔بس ہو جاتی ہے۔موسم تو سارے جوانی کے ہوتے ہیں۔۔۔یاد ہے۔۔۔اس نے مُڑ کے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔سردیوں میں شام میں بس آگ لگا کر آگ بیٹھ جاتے تھے۔بس پھر سردی ہوتی تھی، میں اور تم۔

تم بھی شال اوڑھ لو۔۔۔وہ والی جو میں تمہارے لئے کشمیر سے لایا تھا۔۔۔مجھے ایک ایک چیز کا رنگ بھی یاد ہے۔۔۔یہ نہ کہنا پرانی ہوگئی ہے۔۔۔پچھلے سال کالے رنگ کی لایا ہوں۔۔۔وہ بھی پاس رکھ لو۔۔۔چیزوں میں نیا اور پرانا نہیں دیکھا جاتا۔ خلوص اور محبت دیکھی جاتی ہے۔

نینا اور ارمان کے بچے آئے ہیں۔کہہ رہے تھے کہ ابو، پارک لے کر چلیں اور وہ کہانی سنائیں، ہم سے مہرو۔

ارمان کا بیٹا جب کے.جی (KG) میں تھا کہنے لگا۔۔۔ دادا ابو۔۔۔آپ سے الف ب سیکھنی ہے۔

جب 'م' تک پہنچا تو۔۔۔میں نے کہا۔۔۔'م' سے مہرو۔۔۔۔

ارمان ہنسنے لگا۔ ارمان کو بتا دیا ہے کہ جب بچے بڑے ہوں گے تو اپنی مرضی کی الف بے سکھاؤں گا۔۔۔ مجھے نہیں پرواہ کسی کی۔ قاعدہ بھی بدلنا پڑے تو بدل لوں گا۔۔۔ مگر ذرا بڑے ہو جائیں۔ اٹھارہ سال کے ہوں گے تو سکھاؤں گا۔ اس نے قہقہہ لگایا۔۔۔

اب یہ دنیا والے کیا جانیں کہ الف سے کیا ہے اور ب سے کیا ہے۔۔۔ نازلی سے پوچھو تو کہے گی الف سے اَن کہی، مجھ سے پوچھو تو کہوں گا الف سے ادھوری، ب سے تو بساط ہی ہونا چاہیے اور ز سے زندگی۔ م سے بعد میں بتاؤں گا۔۔۔

لو مغرب بھی ہوگئی۔۔۔ پردے آگے کئے دیتا ہوں۔۔۔ نینا آنے والی ہوگی۔۔۔ آئے گی اور کہے گی۔۔۔ ابا جی۔۔۔ سونے کی ایکٹنگ نہ کیجیئے۔۔۔ دوا کا وقت ہے۔۔۔ نہ دوا لی تو مما کو بتاؤں گی۔۔۔ اور پھر تم اُٹھ کھڑی ہوگی، ٹرے اور پانی لے کر۔۔۔ نہ بابا نہ۔۔۔ تم کو زحمت نہیں دینی۔۔۔ نہ۔۔۔۔۔

....

گوکھووال (فیصل آباد)

ایک دن کوئی لڑکی بھاگ کے آ گئی۔ دربار میں پناہ لی اس نے۔۔۔ اس دن بی بی جی کا پھیرا تھا دربار پہ۔۔۔ وہ۔۔۔ کھو کے سامنے والا ڈیرہ کھولا گیا تھا۔ بڑی محفل تھی ناں۔۔۔ دور دور سے لوگ آرہے تھے۔ میں دربار کے احاطے میں کبوتروں کو دانہ ڈال رہا تھا۔ بی بی جی کا گزر ہوا۔۔۔ میں گم سم ساکت وہی کھڑا رہا۔ بی بی جی نے اپنا ہاتھ آگے

بڑھایا۔۔۔پھر دونوں ہاتھ یوں میرے سامنے پھیلائے جیسے ہم دعا کے وقت ہاتھ اٹھاتے ہیں۔۔۔ میں کچھ دیر ان کے ہاتھوں کی طرف دیکھتا رہا۔۔۔ اچانک۔۔۔ ہچکی بندھ گئی۔۔۔رونے لگا۔زاروقطار رونے لگا۔۔۔بی بی نے پیالے سے دانہ اُٹھایا اور کبوتروں کو ڈالنے لگیں۔ میں بے قابو ہو کے وہیں بیٹھ گیا۔ مجھے اٹھانے بی بی جی کے ملازم آگے بڑھے مگر انہوں نے ہاتھ بڑھا کر منع کر دیا۔

پہلی بار بی بی جی کے لب دیکھے۔۔۔وہ معمولی سا مسکرائیں اور کہا۔۔۔۔غلام حیدر۔۔۔۔ رب کے بھید نہ جاننے کی کوشش کرنا۔۔۔ براشگن ہے۔۔۔ نافرمانی ہے۔۔۔۔حال میں رہ اور مستقبل سنوار۔ماضی پہ پشیماں ہو اور معافی مانگ۔زندگی سدھر جائے گی۔ یہ کہ کر بی بی سرکار حیا کی چادر کا پلو تھامے آگے بڑھی اور بڑھتی ہی چلی گئی۔وہ لڑکی جو خود کو چادر میں چھپائے سہمی بیٹھی تھی۔۔۔کچھ دیر بعد آئی اور اپنے ہاتھ میرے آگے بڑھا دیے اور کہا مجھے تو بتا دو۔۔۔ میری رہائی کب تک ہے۔۔۔ میں چلایا۔۔۔۔ جاؤ۔۔۔ جاؤ۔۔۔ یہاں سے۔۔۔۔ سب کھڑے دیکھ رہے تھے۔درباروں پہ حال چڑھتے رہتے ہیں۔۔۔۔اس دن زندگی کی پہلی دھمال ڈالی تھی۔۔۔۔ جمعرات کی شام تھی۔۔۔۔جیسی ہی ڈھول بجا۔۔۔۔ میں نے ہوش کھو دیئے۔۔۔پھر ایسا نکھرا کے پتہ ہی نہ چلا۔۔۔۔۔۔

جہاں گلاب کی خوشبو سونگھوں۔۔۔ مدہوش ہو جاتا ہوں۔۔۔ گم ہو جاتا ہوں۔۔۔اسی دربار میں۔۔۔کیا کروں۔۔۔وہیں جوکا جو ہو کے رہ گیا تھا۔۔۔عشق ایک قید کا نام ہے۔۔۔۔عشق بیڑیوں کا نام ہے۔عشق زنجیروں کا نام ہے۔۔۔ جو جکڑ دیتی ہیں۔۔۔میں جکڑا گیا تھا۔۔۔عشق کے سوز میں۔۔۔۔عشق کے ساز میں۔۔۔۔میں آج تک نہیں آزاد ہو سکا۔

کیا عشق واقعی قید ہے؟ مشراز نے کہا۔

'مجھے ہمیشہ لگا کہ عشق تو ہر غم سے آزاد کر دیتا ہے۔ پھر ایک ہی غم رہتا ہے، عشق کا غم!! اور کچھ نہیں'۔

آزما لے۔۔۔ بابا چراغ دین نے کہا۔ جہاں بھی چلا جائے۔۔۔ اپنے اصل کی طرف ہی کھنچا آئے گا۔۔۔ اصل۔۔۔۔ بس عشق ہے۔۔۔۔

....

لاہور

'مل گئی ڈگری؟' نازلی نے پوچھا۔

'ہاں۔۔۔۔' مشراز نے جواب دیا۔

'ہاں اور نہ کی قید سے کب باہر آؤ گے؟' نازلی نے کہا۔

'جو دفعہ مجھے پہ لگی ہے۔۔۔ اس کا قیدی کبھی آزاد نہیں ہوتا۔۔۔ کبھی خوشیوں میں قید ہوتا جاتا ہے تو کبھی۔۔۔۔ غموں میں۔۔۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'چائے پیتے ہیں۔۔۔ آؤ۔۔۔۔' نازلی نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

'میں جانتی ہوں یہ ملاقات بھی خاموشی کی ہی نظر ہو گی۔ میں لاکھ پوچھوں کیا ہوا ہے مجھے جواب نہیں ملے گا۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ تم نے مجھے قید کیا ہے ہاں میں خود اپنی مرضی سے قید ہوئی ہوں اس امید پر کہ رہائی تم دلواؤ گے۔'

'کیا سوچ رہی ہو؟' مشراز نے پوچھا۔

وہ ہنسنے لگی۔ تمہیں پتہ ہے کہ میں کچھ سوچ رہی ہوں۔ اس نے جواب دیا۔

'ہاں۔۔۔ خاموش ہوناں۔۔۔ اس لئے۔۔۔' مشراز نے کہا

'جانتی ہو کسی بھی بات کا جواب نہیں ملے گا۔۔ سو خاموشی میں ہی بہتری جانی۔' اس نے جواب دیا۔

’تم نے کچھ پوچھا ہی نہیں۔۔۔‘مشراز نے کہا۔

وہ مسکرانے لگی۔

’تم مجھ سے نظریں ملانے سے گریزاں ہو اور میں نظروں میں ہی سارے سوال چھپائے بیٹھی ہوں۔‘ نازلی نے کہا۔

ہممم م۔۔۔۔مشراز نے جواب دیا۔

’یعنی اب ہاں، نہ۔۔۔کے علاوہ۔۔۔ہمم م کا اضافہ ہوا ہے۔‘ نازلی نے کہا۔

’چھوڑو۔۔۔کہنا سننا سمجھنا بے کار ہے۔‘ نازلی نے کہا۔

’چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے تمہاری۔۔۔‘مشراز نے کہا۔

’چائے۔۔۔۔۔۔ہاں۔۔۔چائے بھی ہے یہاں۔۔۔‘وہ مسکرانے لگی۔

بعض اوقات سوال سمجھ آنے کے بعد بھی جواب دینا مشکل لگتا ہے یا یوں لگتا ہے کہ سمجھ نہیں آ رہا جواب کیا دیا جائے۔ میں بھی اسی شش و پنج میں رہا، مگر میرا مسئلہ اور رہا۔۔۔جب تک مجھے سمجھ آیا کہ مجھ پر محبت کی دفعہ لگ چکی ہے۔۔۔۔دیر ہو چکی تھی۔۔۔ دل بہت چھوٹا سا ہوتا ہے جتنا نظر آتا ہے اس سے بھی چھوٹا۔۔۔کچھ ایسا قدرت کا اصول ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی، اس میں بسیرا کر سکتا۔۔۔۔دوسرے کی جگہ چاہ کے بھی نہیں بنتی۔۔۔اب اور کیا کہوں۔۔۔۔مشراز کچھ کہہ رہا تھا۔

اوہ مشراز۔۔۔تم کب آئے ہو۔۔۔جاوید نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

’کل آیا تھا۔۔۔ابھی ادھر ہی ہوں کچھ دن۔۔۔‘مشراز نے کہا۔

’اور نازلی۔۔۔تم۔۔۔پھر تو تم بھی ادھر ہی ہو گی کچھ پلان کرتے ہیں؟‘ جاوید نے پوچھا۔

’نہیں۔۔۔۔میں چلی جاؤں گی۔۔۔‘ نازلی نے کہا۔

کب؟ جاوید نے پوچھا۔۔۔

'بس رات میں یا صبح میں۔۔۔' نازلی نے چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

'تم آج چلی جاؤ گی؟' مشراز نے پوچھا۔

'ہاں۔۔۔' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ اس انتظار میں تھی کہ شاید وہ کہے رک جاؤ۔ مگر وہ جانتی تھی۔ ایسا نہیں ہوگا۔ کسی کو روکنے کے لئے کوئی جواز چاہیے ہوتا ہے۔ جواز تو کوئی بچا ہی نہ تھا۔ وہ کہہ چکا تھا۔ ایک وقت میں اس دل میں ایک ہی جگہ بن سکتی ہے۔ جواب اس کے پاس تھا۔

....

گوکھووال (فیصل آباد)

بہت پرسوز فضا تھی اس روز۔ دربار پر بہت خاموشی تھی۔ لوگ آ رہے تھے جا رہے تھے۔ وہ لڑکی ایک مہینہ ہوا وہیں تھی۔ بی بی صاحبہ نے ایک کمرہ بھی دے دیا اسے اور کہا اس کا خاص خیال رکھا جائے۔۔۔ نین نقش بہت خوب تھے اس کے۔۔۔' بابا چراغ دین مسکرانے لگا۔

'بابا جی، جب دل میں ایک ہو تو دوسرے کو تو نظر بھر کے بھی نہیں دیکھا جاتا۔ دل کی دنیا میں شراکت داری کہاں؟' مشراز نے کہا۔

بابا ہنسنے لگا۔

'بے صبرا نہ ہو۔۔۔' بابا چراغ دین نے کہا۔

اس دن بی بی صاحبہ نے مجھے حجرے میں بلایا اور کہا، 'غلام حیدر۔۔۔ زلیخا کا سہارا بن جاؤ۔۔۔ فیصلہ تمہارا ہے۔ میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ میں تو اپنا سب کچھ وقف کر چکا تھا۔ جب آیا تھا بس ایک تانگہ تھا اور جیب میں

کچھ روپے۔ وہ بھی درگاہ کے حوالے کر دیے۔ نمک حلال کرنا تھا ناں۔۔۔' اس نے کہا۔

'مشراز زمین پر بیٹھا، خاموشی سے سن رہا تھا۔ اس کی نظریں زمیں پر تھیں۔ وہ مٹی پر بیٹھا تنکے سے دائرہ بنا رہا تھا۔ بابا نے زمین کی طرف دیکھا اور پوچھا۔۔۔ جانتے ہو۔۔۔ دائرہ کیا ہے؟؟'

'نہیں۔' مشراز نے جواب دیا۔

'عشق۔۔۔' بابا چراغ دین نے قہقہہ لگایا۔

'دنیا۔۔۔ آخرت۔۔۔ اصل۔۔۔' وہ ہنستا رہا۔

پھر اپنے ہاتھ سے وہ دائرہ مٹا دیا اور کہا۔۔۔ فانی بھی۔۔۔

مشراز اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ دیکھتا رہا۔ بابا چراغ دین کی خوبصورتی آج بھی ویسے ہی تھی۔ بس چہرے پہ جھریاں تھیں۔ ماس لٹک گیا تھا۔ بال لمبے لمبے۔۔۔ جوانی میں بھی ایسے ہی تھے مگر اب سفید ہو گئے تھے۔ آنکھیں چمکتی جیسے حق کا نعرہ بلند کر رہی ہوں۔ وہ غور سے دیکھ رہا تھا۔

تیرا دائرہ مٹ گیا ہے کا کا۔۔۔ بابا چراغ دین نے کہا۔

'زلیخا، ایک دن لنگر لینے آئی۔ کچھ دیر میرے پاس رکی، پھر تھالی ایک طرف رکھتے ہوئے اپنے ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیئے۔ بتا دے غلام حیدر۔۔۔۔ تیرا کیا جاتا ہے؟'

بی بی صاحبہ کا گزر وہاں سے ہوا۔ میں نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ بی بی صاحبہ گزر گئیں تو میں نے کہا زلیخا۔۔۔ تو میاں سے تنگ آ کے گھر چھوڑ کے آئی ہے؟

'نہیں۔۔۔ اس نے تین بول بولے اور نکال دیا۔۔۔ ماں باپ نے کہا تھا اب تیرا جنازہ ہی اٹھے گا۔۔۔ اسی لئے تو تجھ سے پوچھتی ہوں کہ بتا اب میرا جنازہ کب اُٹھے گا اس گھر سے؟؟'

بی بی صاحبہ کا پیغام آیا۔۔۔غلام حیدر کو بھیجو۔
میں الٹے قدموں بھاگتا ہوا گیا۔ ہاتھ باندھے نظریں جھکائے کھڑا ہو گیا۔

....

سرگودھا

'کیا نام ہے اس لڑکے کا؟' نوید نے پوچھا۔
'کس لڑکے کا؟ مہرو نے پوچھا۔
'اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ وہی جو تمہاری خالہ کے گھر تھا۔ جو تمہارے پیچھے کبھی کمرے میں تو کبھی باہر تھا۔' نوید نے کہا۔
'وہ۔۔۔وہ مشراز ہے۔' مہرو نے بتایا۔
'کیا کہہ رہا تھا؟' نوید نے پوچھا۔
'کیا کہنا۔۔۔کچھ نہیں۔' مہرو نے جواب دیا۔
بیڈ کے دائیں جانب سنگھار میز پڑا تھا۔ اور بائیں جانب صوفے۔ سامنے ایک سٹیل کی پیٹی تھی جس پہ دو سٹیل کے صندوق پڑے تھے۔ مہرو سنگھار میز کی طرف منہ کر کے بیٹھی اپنا زیورا تار رہی تھی۔ نوید صوفے پر بیٹھا اس کا ایک ایک تاثر غور سے دیکھ رہا تھا۔
'جو پوچھا ہے وہ بتاؤ۔۔۔سوال نہ کرو۔۔۔' نوید نے سنجیدہ ہو کر کہا۔
'حال چال سے زیادہ کوئی بات نہیں ہوئی۔' مہرو نے بتایا۔
'حال تو مجھے معلوم ہیں اور تمہاری چال بھی نظر آ رہی ہے۔ یہ سب یہاں نہیں چلے گا۔' نوید نے کہا۔
'اور تم رانو کو میرے پاس کیوں نہیں بیٹھنے دے رہی تھی۔۔۔سب سمجھتا ہوں میں۔' نوید نے کہا۔

'دراصل۔۔۔رانو کی شادی ہے کچھ عرصے میں۔۔۔خالہ اس کو گھر کے کاموں میں دلچسپی لینے کا کہتی ہیں۔بس یہی وجہ تھی۔مہرو نے کہا۔رانو کی شادی؟ کب ہے۔۔۔کس سے؟؟'نوید نے پوچھا۔

'مشراز سے ہی۔۔۔'مہرو نے بتانا ضروری سمجھا۔

'کیا؟ ذکر بھی نہیں کیا کبھی تم نے۔۔۔'نوید نے کہا۔۔۔

'ہاں۔۔۔ایسی کوئی بات بھی تو نہیں تھی۔۔۔'مہرو نے کہا۔

'ویسے۔۔۔اس کے پیر بہت خوبصورت ہیں۔'نوید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مہرو کے کانوں سے وہی نسوانی آواز ٹکرائی جس نے نوید کے متعلق بتایا تھا۔نوید کو خوبصورت پیروں سے بہت شغف ہے۔پائل کا پوچھتا ہے پھر جوتوں کا۔۔۔پھر۔۔۔۔مہرو ڈر سی گئی۔۔۔اتنے عرصے میں وہ یہ جان گئی تھی کہ نوید کے ساتھ نفسیاتی طور پر تو مسئلہ ہے ہی مگر ساتھ ساتھ کردار کا بھی پارسا نہیں۔اُس نے سچ ہی کہا تھا عورت اس کے پاؤں کی جوتی تو ہے ہی مگر خوبصورت لڑکی جب تک حاصل نہ ہو، وہ اس کی کمزوری بھی ہے۔'

مگر کیا کرتی۔۔۔کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

'ایسا کرو رانو کو یہاں بلاؤ۔۔۔تمہیں تو میں اب جانے نہیں دوں گا۔۔۔'نوید نے کہا۔

'یہاں۔۔۔؟'اس نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں۔۔۔وہاں تمہاری میل ملاقاتیں جو شروع ہو جائیں گی۔وہ تو میں اچانک پہنچ گیا ورنہ۔۔۔نوید نے کہا۔مہرو اس کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگی۔

'کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔رانو کو یہاں لے آؤ۔۔۔کچھ دن رہے گی۔۔۔پھر لے جانا واپس۔۔۔'نوید نے کہا۔

'وہ۔۔۔خالہ اکیلی ہوں گی۔۔۔خالو اکثر ہی شہر ہوتے ہیں۔۔۔کہیں جانے

نہیں دیتیں اس کو۔۔۔مہرو نے چیزیں سمیٹتے ہوئے کہا۔۔۔'وہ نوید سے نظریں چُرا رہی تھی۔

'اس نے مہرو کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا۔۔۔ٹھہرو یہیں۔۔۔'

'یہ کون سا طریقہ ہے شوہر سے بات کرنے کا۔۔۔ مجھ سے چلتے پھرتے ادھر ادھر دیکھتے بات نہ کرنا۔تمیز سے توجہ سے رک کر میری بات کا جواب دینا۔۔۔۔اور جواب ہاں میں ہی ہونا چاہیے ہمیشہ۔۔۔'نوید نے کہا۔

'جی۔۔۔'مہرو نے جی کہنے پر ہی اکتفا کیا۔بحث کا فائدہ نہیں تھا، بحث تب کی جاتی ہے جب سننا والا ہو کوئی، پر نہ تو وہ سننے والا تھا نہ سمجھنے والا۔

....

'کیا ارادے ہیں بیٹا۔۔۔؟'نازلی کے ابا نے پوچھا۔

'آکسفورڈ کا سکالرشپ کون چھوڑ سکتا ہے بابا۔۔۔'نازلی نے کہا۔

'باپ کو چھوڑ سکتی ہو؟'ابا نے کہا۔

وہ ہنسنے لگی۔

'بس دو سال کی بات ہے۔ڈگری مکمل کروں گی اور واپس آجاؤں گی۔۔۔۔ آکر آپ کا بزنس دیکھوں گی۔پکا وعدہ۔۔۔۔'نازلی نے کہا۔

'یہ وعدے تم کب سے کرتی آرہی ہو۔'ابا نے کہا۔

'اب ایسے تو نہ کہیں ابا۔۔۔'نازلی نے کہا۔

'جیسے تمہاری مرضی۔۔۔ہم کون ہیں بولنے والے۔۔۔'ابا نے کہا۔

'آپ emotional black mail کر رہے ہیں۔اب۔۔۔'نازلی نے روٹھتے ہوئے کہا۔

میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔۔۔اچانک تمہیں باہر کا دورہ کیسے پڑا۔جب

میں بضد تھا کہ ماسٹرز کی ڈگری باہر سے ہی لے کر آؤ۔۔تب تم لاہور جانے کے خواہشمند تھی۔۔۔اور اب جب۔۔۔۔Stable ہونے کا وقت آیا ہے۔۔۔تم باہر پڑھنے جارہی ہو۔۔۔ابا نے کہا۔

'میں تو لاہور رہ کر ہی اپنا بزنس سیٹ کرنا چاہتی تھی۔۔مگر۔۔۔' نازلی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔۔۔

اور سوچنے لگی۔۔کاش۔۔۔تم میرے لاہور کو میرے لئے ایک شہر ہی رہنے دیتے۔وہاں کچھ بھی نہیں تھا تب بھی اس شہر کا نام خوشی دیتا تھا۔سکون دیتا تھا۔۔۔۔اب میں چاہ کے بھی وہاں کا رخ نہیں کرنا چاہتی، گو کہ۔۔۔۔میرا سب کچھ اب درحقیقت وہاں ہے۔۔۔۔مگر۔۔۔۔

کہاں کھو گئی بیٹا۔۔۔ابا نے پوچھا۔

جب پڑھ کر آؤں گی۔۔۔تب اچھے سے بزنس کروں گی۔وہ ہنسنے لگی۔۔۔

....

اسلام آباد

خزاں آگئی ہے۔۔۔ وہ بوڑھا اپنی ڈائری کھولے بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں قلم تھا۔ ایک نگاہ اس کی طرف مسکرا کے ڈالتا تو دوسری ڈائری پہ اور اقتباس پڑھتا جاتا۔۔۔'جوانی بھی کیا ظالم چیز ہے۔ جوش، جذبہ۔۔۔ ولولہ۔۔۔ کیا نہیں ہوتا تب۔۔۔۔ یہ دیکھو۔۔۔۔ یہ اتنے گہرے الفاظ۔۔۔ 1967 کے ہیں۔۔۔ جب میں کوئی۔۔۔۔ وہ انگلیوں پہ کچھ گننے لگا۔۔۔ کچھ دیر ٹھہر کے بولا۔۔۔ جب میں۔۔۔ بہت پرانی بات ہے۔۔۔اب کیا اپنی عمر بتاؤں۔۔۔تم سے تو چھپانا بنتا بھی ہے۔۔۔ہنسو گی مجھ پہ۔۔۔

پہلی محبت کی داستان۔۔۔پہلی بھی اور آخری بھی۔۔۔۔۔

داستان ختم ہونے والی ہے۔۔۔۔ظاہر ہے اب تو مہمان ہوں۔۔۔۔دو گھڑی کا۔۔۔وہ بوڑھا ہنسنے لگا۔

تم میری آخری محبت ہو۔۔۔۔وہ ہنستا رہا۔۔۔میں تو داستان تب ہی ختم کر چکا تھا۔۔۔تب ہی لکھا۔۔۔۔تم میری آخری محبت ہو۔۔۔خدا گواہ ہے۔۔۔۔پہلی بھی تم ہی تھی۔جانتی ہو۔۔۔بیس سال پہلے مجھے خط موصول ہوا۔۔۔اس نے بہت سی باتیں لکھیں۔ وہ ایک کاغذ ڈائری سے نکال کر پڑھنے لگا۔

سلام لوں یا دعا دوں۔۔۔سلامتی بھی ہے تم پہ اور رب کا کرم بھی۔۔۔میرے کہنے یا نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے۔

بہت مشکل سے تمہارا پتہ معلوم کیا۔سنا ہے بہت بڑے بزنس مین بن گئے ہو۔ وہ پڑھتے ہوئے ہنس پڑا۔۔۔

میں نے بھی کہہ دیا اس کو۔۔۔۔کہاں بزنس مین۔۔۔چھوٹا سا بیوپاری تو ہوں۔۔۔۔

لکھتی ہے۔۔۔۔خط ضرور پڑھ لینا۔۔۔جواب چاہے نہ دینا۔۔۔

پر میں نے تم سے چھپ کے جواب بھی لکھ ڈالا تھا۔وہ اس کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔کیا کرتا پرانی دوست تھی۔پوچھ رہی تھی، فیملی ،کیسی ہے؟ میں نے لکھ ڈالا۔۔۔بھلی ہے۔۔۔

کہنے لگی۔۔۔بیگم سے کب ملواؤ گے؟ میں نے کہا۔۔۔مجھ سے مل لو۔۔۔اس سے مل لو۔۔۔ایک ہی بات ہے۔۔۔مجھ میں اس کا اور اس میں میرا عکس ہی تو ہے۔دل دکھا ہوگا اس کا یہ پڑھ کر۔۔۔ہاں مگر بڑے دل والی تھی۔۔۔اب کا معلوم نہیں۔۔۔عمر کے ساتھ ساتھ دل بھی تو کمزور ہوتا ہے ناں۔۔۔۔وہ ہنسنے لگا۔

اوہ۔۔۔آج کیا تاریخ ہے۔۔۔وہ کیلنڈر دیکھنے لگا۔۔۔

ارے بھئی۔۔۔ چاند کی۔۔۔اس نے خود سے کہا۔۔۔۔

تم نے یاد ہی نہیں کروایا۔۔۔ دو دن بعد۔۔۔ مجھے گاؤں جانا ہے۔۔۔ اپنے لڑکے کو فون لگاؤ۔ نہ مراد بھول کیسے گیا۔۔۔ کہو کے لے جائے مجھے۔۔۔اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

....

رسول آباد (سرگودھا)

'السلام علیکم خالہ۔۔۔۔'نوید نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

'وعلیکم السلام۔۔۔۔' خالہ نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

'جی آیانوں۔۔۔بیٹا۔۔۔'خالہ نے اُٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

'رانو۔۔۔۔۔۔رانو۔۔۔۔۔۔'نوید نے آواز لگانی شروع کی۔

'بیٹا۔۔۔مہرو نہیں آئی؟' خالہ نے پوچھا

'نہ خالہ۔۔۔۔کیا میں تیرا کچھ نہیں لگتا؟'نوید نے کہا۔

'ست بسم اللہ بیٹا۔۔۔' خالہ نے کہا۔

رانو۔۔۔نوید نے پھر سے آواز دی۔

تبھی خالہ تو نے اپنی بیٹی کا پوچھا۔نوید نے کہا۔

آؤ بھئی رانو دیکھو تمہارے لئے کیا لایا۔۔۔نوید نے ساتھ ہی کہا۔

السلام علیکم نوید بھائی۔۔۔۔آپ کب آئے۔۔۔۔ پتہ ہی نہیں چلا۔۔۔رانو نے سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔

یہ دیکھو۔۔۔نوید نے ایک ڈبہ کھولا۔۔۔۔اس میں سرخ رنگ کے جوتوں کا جوڑا تھا۔۔۔اور ساتھ جیب سے ایک پائل نکالی۔۔۔آؤ دیکھو۔۔۔تمہیں پسند ہے نا یہ

سب۔۔۔نوید نے کہا۔

ہاں سب پسند ہے۔۔۔میری مہرو باجی نہیں آئی۔۔۔رانو نے صحن میں پہنچتے ہی سوال کیا۔۔۔

او ہو۔۔۔ مجھے لگا میری دوست کو میری کوئی قدر ہوگی۔۔۔مگر یہاں تو سب کو مہرو کی فکر ہے۔۔۔نوید ہنسنے لگا۔۔۔خالہ چائے نہیں پوچھیں گے۔۔۔نوید نے کہا۔۔۔

مہرو۔۔۔خالہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ نوید نے کہا۔۔۔

آج میں صرف آپ ہی کے ہاتھ کی چائے پینے آیا ہوں۔۔۔

کتنا جھوٹ بولتے ہیں آپ۔۔۔رانو نے جوتے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا۔۔۔اب کچھ دیر بعد کہیں گے کہ رانو میں صرف تمہارے لئے آیا۔۔۔رانو ہنسنے لگی۔۔۔

بھائی کو کوئی ایسے کہتا ہے کیا۔۔۔خالہ ہنسنے لگی۔

نہیں نہیں خالہ کہنے دیں۔۔۔میری دوست ہے۔۔۔آپ مجھے بس چائے پلا دیں۔۔۔نوید نے کہا۔

ضرور بیٹا۔۔۔کیوں نہیں۔۔۔ چارونا چار خالہ کو چائے بنانے جانا ہی پڑا۔۔۔

رانو۔۔۔پازیب تو پہن کے دکھاؤ۔۔۔لگتا ہے۔۔۔پسند نہیں آئی۔۔۔نوید نے کہا۔

بہت زبردست ہے بھائی۔۔۔۔رانو نے کہا۔۔۔

....

گوکھووال (فیصل آباد)

چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔دور دور تک کھیت کھلیان ہی دکھائی دے

رہے تھے۔ اور ان میں یہ چھوٹا سا دربار۔۔۔ سب ویسا ہی تھا۔۔۔ بالکل ویسا ہی جیسا میری جوانی میں تھا۔ اس نے دربار کے احاطے میں موجود کنویں کے کناروں پر دیے جلاتے ہوئے سوچا۔ مسکراتا رہا اور پھر بابا فقیرے کی قبر کے پیروں میں ایک اور مٹی کی قبر تھی۔ اس کے قدموں کی جانب جا بیٹھا۔۔۔ بوڑھے ہاتھ کانپتے تھے، ان میں دم نہ تھا۔ ہاں مگر دعا کے لئے اب بھی بہت دیر تک اٹھائے رکھتا تھا۔۔۔ وہ بابا چراغ دین کی قبر پر فاتحہ کرتے ہی ہاتھ اٹھائے ماضی کے جھروکوں میں جا ڈوبا۔۔۔ وہیں پہ۔۔۔ جہاں بی بی صاحبہ نے غلام حیدر کو بلایا تھا۔

کیا سوچا غلام حیدر۔۔۔؟ بی بی صاحبہ نے پوچھا۔۔۔

سوچنا کیا بی بی صاحبہ۔۔۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔۔۔ میری سات پشتیں قربان۔۔۔ وہ نظر جھکائے یہ سب کہہ رہا تھا۔۔۔ حیا کی چادر آڑے تھی۔

ٹھیک ہے۔۔۔ جمعہ کا دن مبارک ہے۔۔۔ کل نکاح کی تیاریاں کرو۔۔۔ بی بی صاحبہ نے کہا۔

جو حکم۔۔۔ غلام حیدر نے کہا اور چلا گیا۔

حجرہ تیار تھا۔ غلام حیدر سفید جوڑا پہنے کمرے میں داخل ہوا۔ زلیخا بھی وہی بیٹھی تھی۔ سرخ جوڑا پہنے جو ہر دلہن کی پہچان رہا ہے۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی زلیخا نے کہا۔

غلام حیدر۔۔۔ یہ دیکھ۔۔۔ اب تو بتا دے۔۔۔ میری رہائی کب ہے؟ وہ اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلائے کھڑی تھی۔

بیٹھ جا او جھلیے۔۔۔ رب کے بھید رب ہی جانے۔۔۔ بی بی صاحبہ کا حکم ہے۔۔۔ کہ رب کے کاموں میں دخل اندازی نہ کرو۔۔۔ جتنا دکھایا اس نے اتنا ہی دیکھوں۔۔۔ غلام حیدر نے کہا۔

تو یہ بھی تو تجھے ہی دکھتا ہے ناں۔۔۔۔ہمیں کیوں نہیں دکھتا۔۔۔ زلیخا نے کہا۔۔۔۔

ایک بات بتا۔۔۔۔ تجھے کیسے پتا کہ بی بی صاحبہ کے ہاتھ آگے آتے ہی مجھے یکدم کیا ہوا؟ غلام حیدر نے پوچھا۔

زلیخا ہنسنے لگی۔۔۔غلام حیدر۔۔۔رب کے کھیل ہیں سارے۔۔۔جسموں کا ملن ارادی ہوتا ہے۔۔۔۔روحیں تو غیر ارادی طور پر ملتی ہے۔۔۔ جیسے میرا اور تیرا ملن ہوا۔۔۔بالکل انجانے میں۔۔۔

اس سے بی بی صاحبہ کا کیا تعلق؟ غلام حیدر نے پوچھا۔

بی بی صاحبہ کا تعلق نہیں۔۔۔۔۔ جہاں روحوں کا ملن ہوتا ہے وہاں کچھ کہنا سننا نہیں پڑتا۔۔۔خاموشی ہی زباں بنتی ہے۔۔۔۔زلیخا نے کہا۔

اور چراغ بجھ گئے۔ مکمل طور پر خاموشی تھی۔۔۔۔ سناٹا۔۔۔۔ جیسے صدیوں سے یہاں نہ کوئی آیا ہو۔۔۔۔نہ کسی کا گزر رہا ہو۔

....

سرگودھا

'آپ پچھلے ہفتے خالہ کی طرف گئے تھے۔۔۔؟' مہرو نے پوچھا۔

'یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو؟' نوید نے پوچھا۔۔۔

'جی۔۔۔۔' مہرو نے کہا۔

'پہلے والی کو بھی نکال باہر پھینکا تھا۔ بہت سوال کرتی تھی۔۔۔ کہاں سے آئے ہو۔ کہاں گئے تھے۔۔۔کیوں گئے تھے۔۔۔'؟ نوید نے کہا۔۔۔

'مجھے لڑکیوں کی کمی نہیں۔۔۔۔ بے تحاشا ہیں۔ پتہ نہیں کہاں پھنس گیا میں۔۔۔'

نوید نے کہا۔۔۔

'میں نے صرف پوچھا ہے۔۔۔۔ کیونکہ آپ نے بتایا نہیں۔۔۔'مہرو نے کہا۔۔۔

'میں تمہاری اجازت کا نہیں بلکہ تم میری اجازت کی محتاج ہو۔۔۔'یہ کہتے ہی اس نے پہلا تھپڑ مہرو کے گال پہ دے مارا۔۔۔

مہرونم آنکھیں لئے اس کو جاتا دیکھتی رہی۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بیڈ کے ساتھ پڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔ بس یہی کچھ تھا کیا میرے لئے۔۔۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ نوید پھر سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک جوتے کا ڈبہ اور پائل تھی۔ اس کے سامنے پھینکا اور کہا۔۔۔ آج پھر جاؤں گا اور رانو شہزادی کو دوں گا۔۔۔ میری تو قسمت خراب تھی، تم جیسی بدصورت ادھیڑ عمر عورت میرے پلے باندھ دی گئی۔ دولت کی کمی نہیں میرے پاس۔۔۔ ہوں بھی جوان ہی۔۔۔ بلکہ اپنی عمر سے چار پانچ سال چھوٹا ہی لگتا ہوں۔۔۔ کچھ کر سکتی ہو تو کر لو بی بی۔۔۔۔ یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔

نہیں۔۔۔۔ کچھ نہیں۔۔ عورت کر ہی کیا سکتی ہے؟ مہرو نے کہا۔

عورت بہت کچھ کر سکتی ہے۔۔۔ رو سکتی ہے۔۔۔ سسک سکتی ہے۔ ٹسوے بہا سکتی ہے۔۔۔ اتنا کچھ تو کر سکتی ہے۔۔۔'نوید نے سامان اُٹھاتے ہوئے کہا۔۔۔

'ٹھیک کہتے ہیں آپ۔۔۔'مہرو نے کہا۔

'بس ایسے ہی کہا کرو۔۔۔ اور سنا کرو۔۔۔ سوال۔۔۔ نہیں کرنا کبھی۔۔۔ آئی سمجھ۔۔۔؟'نوید نے کہا۔

'جی۔۔۔'مہرو نے جواب دیا۔

'مسئلہ کوئی نہیں مجھے۔۔۔ آج تمہیں چھوڑوں تو کل تیسری کر لوں۔۔۔'وہ ہنسنے لگا۔

....

گوکھووال (فیصل آباد)

بابا چراغ دین بھی ناں۔۔۔ کیا طبیعت پائی تھی۔۔۔ زندوں میں سے ہے۔۔۔ سچ کہتے ہیں۔۔۔ عشق زندہ رکھتا ہے۔۔۔ بس عشق۔۔۔ باقی سب ختم ہو جائے گا۔۔۔ اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

گاڑی باہر کھڑی تھی۔ اس کا بیٹا نہایت خاموشی سے انتظار کر رہا تھا۔ باپ کو آتا دیکھ کر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہاتھ پکڑ کر گاڑی تک لایا اور پوچھا۔ کیسی رہی ملاقات ابا جان۔۔۔؟

'بہترین۔۔۔' باپ نے جواب دیا۔

'ہمیشہ کی طرح۔۔۔' بیٹے نے کہا۔

'میں بیٹھتا ہوں۔۔۔ جاؤ مل آؤ۔۔۔ بابا جی کو میری شکایتیں نہ لگانا اب۔۔۔۔ پہلے ہی میں بہت دیر باتیں کر آیا۔۔۔ بہت سا وقت لیا۔۔۔ ہمیشہ کی طرح۔۔۔۔ وہ مسکرانے لگا۔

'آپ بیٹھئے۔۔۔ میں آیا۔۔۔' جوتے درخت کے پاس سیڑھیوں میں اُتارتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔

کچھ دیر کنویں کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ بھی مسکرا رہا تھا۔ بوڑھا باپ گاڑی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ خود کلامی کرنے لگا۔۔۔

میں جانتا ہوں۔۔۔ اب تم اندر جاؤ گے۔۔۔ کھڑے رہو گے۔۔۔ اور باتیں کرو گے بابا جی سے۔۔۔ پھر آنکھیں موندھے خاموشی سے ہاتھ باندھے کھڑے رہو گے۔۔۔ پھر مٹکے سے پانی بھرو گے۔۔۔ اور کنویں کے کنارے پر رکھ دو گے۔ پھر نلکے سے پانی پیو گے۔۔۔ وہ مسکراتا رہا۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ میں جانتا ہوں۔۔۔ کیونکہ وہ بختاں والی

بھی یہی کرتی رہی۔۔۔

وہ ہنسنے لگا۔

....

رسول آباد (سرگودھا)

'مہرو بیٹا۔۔۔ایک بات بتا۔۔۔یہ تیرے چہرے پہ نشان کس چیز کا؟؟' خالہ نے پوچھا۔

'وہ۔۔۔۔ کچھ نہیں خالہ۔۔۔۔ ذرا چوٹ آ گئی تھی۔۔۔' مہرو نے جواب دیا۔

'چوٹ۔۔۔۔یہی تو پوچھا۔۔۔۔کہ چوٹ آئی کیسے؟' خالہ نے پوچھا۔۔۔

'گر گئی تھی۔۔۔۔' مہرو نے کروٹ بدلتے ہوئے جواب دیا۔

'گرنے سے ایسی چوٹ نہیں آتی بیٹا۔۔۔' خالہ نے جواب دیا اور خاموش ہو گئیں۔

کھلے آسمان کے نیچے چار پائی پر پڑے اسے آسمان کی سیاہی نظر آ رہی تھی۔۔۔ وہ الگ بات ہے کہ تاروں بھری رات تھی اور چاند بھی پورا تھا۔۔۔ چودھویں کا۔۔۔۔آنسو آنکھوں سے بہہ کے تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔اسے گزشتہ رات کا منظر یاد آ رہا تھا جب نوید نے رانو کے پیروں کی تعریف کی۔

'پیر دیکھیں ہیں کبھی اپنے؟؟' نوید کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔۔۔

'رانو کو دیکھو۔۔۔۔کتنی حسین۔۔۔ کتنے خوبصورت پیر۔۔۔ پائل بھی پہنے تو سجے۔۔۔' نوید نے کہا۔

'رانو ابھی بچی ہے۔۔۔۔کم عمر ہے۔۔۔اسی عمر میں تو حسن عروج پر ہوتا ہے'، مہرو نے جواب دیا۔۔۔۔

'نہ تو تیرا حسن کہاں گیا۔۔۔میرے حصے میں تو ہی آئی تھی کیا؟؟ رانو کی تو شکل بھی نہ دیکھنے کو ملی پہلے۔۔۔۔' نوید نے کہا۔

'شریف مرد۔۔۔۔اپنی ہی بیوی پر دھیان دیتے ہیں۔۔۔۔اور ویسے بھی آپ لوگوں کو جلدی بہت تھی۔۔۔شاید۔۔۔۔یہی بہتر تھا۔۔مہرو نے پانی کا گلاس اس کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

نوید نے گلاس زمین پر پٹختے ہوئے کہا۔مرد۔۔۔مرد ہوتا ہے۔۔۔ساری عمر جوان اور حسین رہنے والا۔۔۔۔ پچاس کا بھی ہو جائے نا تو آرام سے ۲۱، ۲۲ کی لڑکی ہاتھ آ جاتی ہے۔۔۔۔بس دولت ہو اور صورت۔۔۔ دونوں میرے پاس ہیں۔۔۔۔ نوید نے کہا۔

مہرو نے نظر اُٹھا کے دیکھا، ابھی کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ اگلے لمحے ہی ایک زوردار تھپڑ اس کی گال پہ تھا۔۔۔وہ بری طرح چکرا گئی۔

ہوش آیا تو بیڈ پر تھی اور خالہ اس کے پاس۔۔۔۔

خالہ کچھ دن اس کو لے جاؤ اپنی پاس۔۔۔۔ ویسے بھی خوشخبری کی اُمید ہے۔۔۔تو نانی بننے والی ہے۔۔۔یہ سارا دن اکیلی ہوتی یہاں۔۔۔تیرے پاس دل بھی بہل جائے گا اور دیکھ بھال بھی ہو گی۔

'ماؤں کے در کبھی بند نہیں ہوتے۔۔۔۔لے جاؤں گی بیٹا۔۔۔' خالہ نے نوید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

....

گوکھووال (فیصل آباد)

'نوکری لگ گئی ہے میری اماں۔۔۔۔'مشراز نے بتایا۔

'اچھی بات ہے۔۔۔۔شکر ہے ماں کو پہچانتا ہے ابھی۔۔۔۔'اماں نے جواب دیا۔

'گڑیا۔۔۔مٹھائی تو دو اماں کو۔۔۔'مشراز نے کہا۔۔۔۔

'اماں کھائیں نہ کھائیں۔۔۔ میں تو کھاؤں گی۔۔۔ بھائی کی شادی کی نہ سہی۔۔۔نوکری کی سہی۔۔۔۔'گڑیا نے کہا۔

'تجھے نوکری کی ضرورت ہے بھلا۔۔۔۔؟؟'اماں نے پوچھا۔

'یہ زمینیں کون دیکھے گا۔۔۔۔اور وہ کھووالی دکانیں۔۔۔پورا گاؤں جانتا ہے کہ میرا بیٹا میرا نہیں رہا۔۔۔۔ دو ماہ سے حلوائی والے نے کرایہ نہیں دیا۔۔۔منشی گیا بھی تھا۔۔۔ٹال مٹول کرتا رہا۔۔۔۔۔۔۔اور تو اور۔۔۔۔۔۔'اماں کی تقریر ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ گڑیا نے کہا۔۔۔۔

'اوہ۔۔۔۔ یاد آیا۔۔۔۔۔۔ مہرو باجی آئی ہوئی ہیں۔۔۔۔ رانو بتا رہی تھی۔۔۔۔ کہہ رہی تھی کافی چوٹیں آئیں ہیں۔۔۔ایسا لگ رہا ہے نوید بھائی نے مارا ہے۔۔۔۔بتاتی نہیں ہیں۔۔۔'گڑیا نے کہا۔۔۔۔

'تجھے کوئی اور کام نہیں۔۔۔۔ ہمارا کیا واسطہ اب ان سے۔۔۔۔ایک ایک بہن تھی میری۔۔۔۔ اس سے بھی رشتے ناطے ختم کروانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اس نے۔۔۔۔'اب تجھے وہ مہرو یاد آ گئی۔۔۔اماں نے کہا۔۔۔۔

'اوہو۔۔۔۔مہرو باجی کا کیا قصور۔۔۔۔ وہ تو بہت اچھی ہیں۔۔۔'گڑیا نے کہا۔۔۔۔

’تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟‘مشراز نے کہا۔

’لے بتالے اب۔۔۔‘ماں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

’اماں میں کل خالہ کی طرف جاؤں گا‘۔۔۔اس نے اعلان کرتے ہوئے کہا۔

’یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے۔‘ماں نے کہا۔

’ہاں۔۔۔۔میں جانتا ہوں۔۔۔۔مگر۔۔۔۔۔۔۔ضروری ہے۔۔۔‘مشراز نے کہااوراٹھ کھڑا ہوا۔

’ہاں ہاں۔۔۔بہت ضروری ہے۔۔۔ماں نے ساری عمر تیرے باپ کا پیچھا نہ چھوڑااوراب یہ۔۔۔۔پتا نہیں کیا جادو کر دیتی ہیں جو مرد اندھے ہوئے چلے جاتے ہیں۔‘ ماں کہنے لگی۔

مشراز وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوااور کمرے میں چلا گیا۔ چار پائی کے ساتھ ٹیبل پر پڑا لیمپ، اس کی روشنی کی طرف غور سے دیکھنے لگااور سوچنے لگا،’کس جرم کی سزا اس کو ملی ہے، وہ تو بہت اچھی ہے۔کیا اچھے لوگوں کے نصیب ایسے ہوتے ہیں یا کسی اور کے گناہ کی ان کو سزا ملتی ہے۔ میں نے محبت کی تھی، مجھے محبت کی سزا ملی، مگر مہرو نے تو وہ بھی نہ کی۔ اس کا قصور۔۔۔کہ عمر زیادہ ہےتو بیاہ دو۔۔۔۔آنکھیں بند کر کے۔۔۔ کیونکہ سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ معاشرہ میری اور اس کی شادی نہ مانتا، میری اس سے محبت نہ مانتا۔۔۔مگراس کوایک درندے کے قبضے میں دینے سے مطمئن ہے۔ باتیں تو تب بھی سب نے کی ہوگی۔۔۔ہاں مگر justify کیا ہوگا کہ عمر کا تقاضا تھا۔اس عمر میں اس کی ایسے ہی شخص سے شادی بنتی ہے۔ کیا ایک دوسرے کا مطمئن ہونا یا خوش ہونا کوئی جواز پیش نہیں کرتا؟؟

....

بابا چراغ دین

اگلی صبح ایک شور شرابے سے ہوئی۔ ایک رونق سے ہوئی بالکل ایسے جیسے کسی بیوہ کا سہاگ آباد ہوا ہو اور وہ سفید جوڑے سے پل بھر میں ہی سرخ جوڑا سجائے، سرخ چوڑیاں پہنے مسکراتی، چہچہاتی پھولوں کو بالوں میں سجالے، ایسے جیسے بنجر زمین یکا یک پھولوں سے مہک اُٹھے۔ غلام حیدر سفید شلوار قمیض پہنے، خوشبو لگائے کمرے سے باہر آرہا تھا کہ زلیخا نے آواز دی۔

'غلام حیدر، کل بی بی صاحبہ نے مجھے تیری غلامی میں دے دیا تھا۔ باندی تیرے سامنے ہاتھ باندھے منتظر ہے، ناشتہ کرتا جا ورنہ سب کیا کہیں گے کہ گھر والی کھانا نہ دے سکی۔ میں جانتی ہوں، جانے والے کو پیچھے سے آواز نہیں دیتے مگر بعض اوقات مُڑ کے آنا ہی فائدہ مند ہوتا ہے، آ بیٹھ ناشتہ کر لے۔' زلیخا نے کہا۔

'تو سو رہی تھی، سو چا تیری نیند خراب ہوگی۔' غلام حیدر پیڑھی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

'سچ بتاؤں تو کل پہلی رات، بہت عرصے بعد سکون سے سوئی۔ بہت آرام سے، ایسے جیسے کسی مخمل کا بستر ہو، کئی کنیزیں مجھے پنکھا جھل رہی ہوں اور میں ایک شہزادی بلکہ ملکہ کی طرح آرام سے سو رہی ہوں۔ میرے پلنگ کے کنارے ایک نہر بہہ رہی ہو، بہت ہی خوبصورت نہر۔ (وہ اس کو ہاتھ سے اشارہ کر کے بتانے لگی) اُس طرف، بلکل یہ اس پلنگ کے دوسرے کنارے بہت سے پھل لگے ہوں اور وہ سامنے پھول ہی پھول ہوں۔ اور خوشبو ایسی کہ جیسے گلاب کے باغ میں میرا گھر ہو۔'

غلام حیدر ہاتھ میں نوالہ پکڑے اُسے دیکھ کر مُسکرا رہا تھا۔

'ایسے کیا دیکھ رہا ہے، ناشتہ کر۔۔۔' زلیخا نے دوپٹے کا پلو منہ میں ڈالتے ہوئے

کہا۔

'کچھ نہیں، تُو ناشتہ نہیں کر رہی؟' ۔غلام حیدر نے پوچھا۔

'تو کرلے، میں پھر کرلیتی ہوں۔۔۔تیرے بعد۔۔۔' زلیخا نے کہا۔

'کرلے، خیر ہے۔۔۔میری کیا اوقات؟' غلام حیدر نے کہا۔

'اچھا، میں سوچ رہی تھی کہ بی بی صاحبہ آئیں تو مل کر ان کے پاس چلیں گے۔ اکیلے نہ جانا۔' زلیخا نے کہا۔

'ٹھیک ہے۔ جیسے تو چاہے۔' غلام حیدر نے کہا۔

حُجرے سے باہر ویسے ہی پُرانی صبح تھی۔ چہچہاتی ہوئی، خاموش سی، رونق بھی تھی اور خاموشی بھی۔ اگربتیوں اور گلاب کی خوشبو سے پورا دربار مہک رہا تھا۔

'غلام حیدر۔۔۔مبارک ہو۔' بخشو بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا۔

'دعا کی تھی میرے لئے؟' اس نے آتے ہی پوچھا۔

'ہاں بخشو۔۔۔کی تھی۔ تجھے جلد خوشیاں ملیں، تیری بیٹی کی مشکل جلد آسان ہوگی۔ اسے تکلیف سے جلد نجات ہوگی۔' غلام حیدر نے کہا۔

'غلام حیدر۔۔۔سرکار۔۔۔بی بی صاحبہ نے کہا ہے کہ آج تیرا ولیمہ ہے ہو گا۔ سب کو کھانا وہی دربار کے احاطے میں دیا جائے گا۔ تو بھی آ جانا، زلیخہ کو لے کے۔' کریم نے گزرتے ہوئے اطلاع دی۔

بخشو کھڑا کچھ سوچتا رہا اور غلام حیدر کو جاتا دیکھتا رہا۔ دوپہر تک کھانے کے سارے انتظامات مکمل تھے۔ خلافِ توقع بی بی صاحبہ وہاں موجود تھیں۔ حالانکہ آج ان کا دن نہ تھا۔

'زلیخا، اپنے سر کے سائیں کا بہت خیال رکھنا۔' بی بی صاحبہ نے کہا۔

'کبھی شکایت نہیں ہوگی سرکار۔' زلیخا نے کہا۔

'غلام حیدر۔۔۔ بہت عزت کرنا زلیخا کی۔عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔'
بی بی صاحبہ نے کہا۔
'جو حکم۔۔۔' غلام حیدر سر جھکائے کھڑا رہا۔

....

سرگودھا (رسول آباد)

'حیدری، دیکھ دروازے پہ کون ہے؟' خالہ نے آواز لگائی۔
'میں دیکھتی ہوں، حیدری بازار تک گیا ہے۔رانو نے کچھ لینے بھیجا ہے۔' مہرو نے کہا۔
'تو آرام کر بیٹا، میں دیکھ لیتی ہوں۔' خالہ نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھیں۔
رانو تیزی سے سیڑھیاں اُتری اور کہنے لگی،'میں دیکھتی ہوں، آج برسوں بعد کوئی بھولا آیا ہے۔' وہ ہنسنے لگی۔
زلفیں لہرائے ، چوڑیوں کی چھن چھن اور پائل کی چھنکار چارسُو پھیلاتے وہ دروازے پر کھڑی تھی۔
'اسلام علیکم! کیسے یاد آئی ہماری آج؟؟' رانو نے چلبلے انداز میں کہا۔
'راستہ دو رانو' مشراز نے کہا۔
'اوہ۔۔۔ خیر سے مزاج بگڑے ہیں جناب کے۔۔۔۔ آیئے۔۔۔ آیئے۔۔۔پدھاریئے۔۔۔' وہ ہنسنے لگی۔
مشراز تیزی سے اندر چلا گیا۔
'ارے کس کے ساتھ بحث کر رہی ہے۔۔۔ایک تو یہ لڑکی بھی ناں۔۔۔' خالہ

کہنے لگی۔

'ہائے میرے اللہ۔۔۔ ماں صدقے۔۔۔ میرا شیرو آیا۔۔۔ست بسم اللہ میرے پتر۔۔۔' خالہ ایک دم کرسی سے اُٹھ کر بلائیں لینے لگی۔

وہ ایک دم مہرو کی طرف دیکھنے لگا۔۔۔مہرو سامنے پلنگ پہ لیٹی تھی۔۔۔اٹھ بیٹھی۔۔۔

'آپ کو کیا ہوا؟؟ یہ چوٹ کیسے آئی اور اتنی کمزور کیوں ہو گئیں۔۔۔' وہ ایک ہی سانس میں ڈھیر سوال کر بیٹھا۔

'آؤ۔۔۔بیٹھو تو سہی بیٹا۔۔۔' خالہ کہنے لگی۔

'جی خالہ۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'اب تو میرے ہاتھ کی سردائی پینی پڑے گی۔۔۔' رانو نے کہا۔

اس نے رانو کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے کہا کہ آپ بتائیں۔۔۔ باقی سب خیر خیریت ہے؟ آپ کے شوہر نہیں آئے؟'

مشراز نے پھر آس پاس سے بے خبر سوالوں کی بوچھاڑ کر ڈالی۔ وہ الجھا ہوا تھا۔ اس کا دل، دماغ یہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا کہ کوئی اس کی مہرو پہ ہاتھ اُٹھائے، وہ خود دیکھ کر تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ نہ صرف تصدیق بلکہ تسلیم کرنا چاہتا تھا۔ اسے اس حقیقت کے لئے جواز چاہئے تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین کرنا چاہتا تھا۔

'تُو بتا بیٹا۔۔۔تھکا ہوا ہے۔۔۔امی کی سُنا۔۔۔' خالہ نے کہا۔

'جی خالہ، امی بھی ٹھیک ہیں۔۔۔گڑیا بھی ٹھیک ہے۔۔۔سب ٹھیک ہیں۔۔۔' اس نے مہرو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔

'تیری پڑھائی مکمل ہو گئی؟' خالہ نے پوچھا۔

'جی۔۔۔نوکری بھی لگ گئی۔' مشراز نے کہا۔

'ماں۔۔۔قابل ہے بہت۔۔۔ بھانجا تمہارا۔۔۔'رانو نے ہنستے ہوئے کہا۔

'باتیں نہ بنا، چائے بنا جا کے۔۔۔میں آتی ہوں۔۔۔'خالہ نے رانو سے کہا۔

یہ لسی دودھ والے بابو ہیں، چائے والے نہیں۔۔۔'رانو نے جواب دیا۔

'بیٹا۔۔۔تم بیٹھو۔۔۔ میں تمہارے کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔۔۔' خالہ نے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

'آپ کو کیا ہوا ہے؟' اس نے ایک بار پھر بے چینی سے پوچھا۔

'کچھ نہیں۔۔۔تم بتاؤ۔۔۔ کیسے آنا ہوا۔۔۔وہ بھی اچانک؟'مہرو نے کہا۔

'کیا بتاؤں؟ آپ کچھ بتا رہی ہیں کیا؟ آپ باتیں چھپانے لگی ہیں۔۔۔'مشراز نے کہا۔

'پہلے کب بتاتی تھی؟؟'مہرو نے کہا۔

'نہیں۔۔۔پہلا ایسا کچھ تھا بھی نہیں۔۔۔'مشراز نے کہا۔

'میں خالہ کا ہاتھ بٹاؤں۔۔۔وہ اکیلی نہیں بنا سکیں گی۔۔۔'مہرو نے کہا اور اُٹھنے لگی۔

'آپ آرام کریں۔آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'مشراز نے کہا۔

'مجھے کچھ نہیں ہوا۔۔۔'اس کی آنکھیں نم اور لہجے میں سختی تھی۔وہ جانتا تھا وہ کبھی ایسی نہ تھی۔مگر آپ کے حالات، ماحول، آپ پہ اثر کر جاتے ہیں۔۔۔آپ جتنے بھی مضبوط کیوں نہ ہوں۔۔۔ پتھر پہ بھی پانی کا قطرہ گرتا رہے تو اس میں بھی سوراخ ہو جاتا ہے۔ انسان تو پھر انسان ہے۔۔۔ جہاں حالات موم کر دیتے ہیں وہاں مجبوریاں چھید کر جاتی ہیں۔آپ کی ذات کو متاثر کر دیتی ہیں۔بری طرح۔۔۔۔خاص طور پر تب جب بات کرنے والا کوئی نہ ہو۔۔۔اور پھر طلاق کا دھبہ۔۔۔۔دھبہ ہی سمجھا جاتا ہے۔۔۔بعض دفعہ چوٹ بہتری کے لئے لگتی ہے۔۔۔زخم ہوتا ہے، گہرا ہوتا ہے اور بھرنے کے لئے ہوتا ہے۔شادی دیر سے ہونا۔۔۔معاشرے نے برائی بنا دیا۔۔۔شادی کامیاب نہ ہوئی مگر

گھر تو عورت کو ہی بسانا ہے۔۔۔۔ کیونکہ عورت کا ہی کام ہے۔ یہ جملے مجبور کر دیتے ہیں۔ مہرو جیسی مضبوط لڑکی کو بھی۔

'میں جانتا ہوں آپ خوش نہیں ہیں۔۔۔ اتنا عرصہ خالہ خالو نے سنبھالا۔۔۔ اور اب پھر ان پر بوجھ نہیں بننا چاہتیں۔۔۔ مگر۔۔۔۔ آپ کی اہمیت اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔۔۔ آپ خود اپنے بارے میں، اپنی وقعت کے بارے میں سوچیں۔۔۔ آپ نہیں سوچیں گی تو کوئی نہیں سوچے گا۔' مشراز نے کہا۔

'کیسی باتیں کر رہے ہو؟' مہرو نے کہا۔

'جو آپ کا چہرہ کہہ رہا ہے۔' مشراز نے کہا۔

'میرا چہرہ۔۔۔۔۔۔ مت دیکھو میری طرف۔۔۔' اس نے غصے سے کہا۔

اتنے میں رانو کی سہیلی سلمیٰ کمرے میں داخل ہوئی۔

'میں رانو کو ڈھونڈ رہی تھی۔' سلمیٰ نے کہا۔

مہرو کی نم آنکھیں سب باتوں کا جواب تھیں۔

سلمیٰ نے ایک نظر مہرو پہ ڈالی اور پھر مشراز کو دیکھنے لگی۔

'وہ خالہ کے ساتھ کھانا بنوا رہی ہے۔' مشراز نے کہا۔

سلمیٰ نے دونوں کو مشکوک نظروں سے دیکھا اور رانو سے ملنے چلی گئی۔

'ادھر سُن۔۔۔۔ تو کچن میں گھسی رہ۔۔۔ جھلی ہے تو۔۔۔' سلمیٰ اس کو کھینچتے ہوئے برآمدے میں لے آئی۔

'ہوا کیا؟' رانو نے بال سلجھاتے ہوئے کہا۔

'کہا تھا تجھے کہ کچھ تو ہے، یہ ہی ہے تیری مہرو باجی۔۔۔ تیرے راستے کی رُکاوٹ۔۔۔ وہ کیسے مان لے کہ تیرا ہونے والا منگیتر اتنا حسین ہے۔۔۔۔ برا نہ ماننا۔۔۔ میں نے بہت بار رات میں ان کو چھت پہ بھی ٹہلتے دیکھا ہے۔ ایک بار تو صبح

رومینٹک موسم تھا۔۔۔ ہلکی ہلکی بارش۔۔۔۔۔۔اور یہ دونوں۔۔۔۔مست تھے۔۔۔ خوش گپیوں میں۔۔۔۔،سلمیٰ نے آگ لگاتے ہوئے کہا۔

رانو کچھ سوچنے لگی۔۔۔تبھی یہ بار بار مجھے چائے لینے اور لسی، پانی لینے بھیج دیتے ہیں۔' اس نے کہا۔

'اور تو جھلوں کی طرح اٹھ کے آجاتی ہے۔ میں تو کرتی ہوں سچی بات۔۔۔تیری سہیلی ہوں۔۔۔تیرا بھلا کہتی ہوں۔' سلمیٰ نے کہا۔

'کتنے میسنے ہیں یہ دونوں۔۔۔پر مہرو باجی ایسی نہیں۔۔۔!' رانو نے کہا۔

'مہرو باجی۔۔۔تجھے کیا پتہ۔۔۔مرد ذات کو تو موقع چاہیئے، یہ تو مہرو باجی کو چاہئے کہ اسے قریب نہ آنے دیں۔ سمجھدار ہیں وہ آخر کو۔۔۔سارا معلوم ہے انہیں۔ اور جو لڑائی جھگڑا ہے، مجھے لگتا ہے وہاں محلے میں بھی ان کے ایسے ہی کام ہوں گے تبھی نوید بھائی نے دو لگائی ہوں گی۔ اور دیکھو ان کے آتے ہی مشراز آ گیا۔'

رانو سوچتی رہ گئی۔

'رانو۔۔۔تو کہاں چلی گئی۔۔۔' خالہ نے آواز دی۔

'ہاں جی۔۔۔رانو کہاں کہاں جائے۔۔۔کچن میں، کمرے میں۔۔۔صحن میں۔۔۔چھت پہ۔۔۔' رانو اپنے ہی انداز سے بولتی چلی گئی۔

'زیادہ باتیں نہ بنا۔۔۔مہرو اٹھ کے باہر جا رہی تھی، گر پڑی۔۔۔ہاتھ پیر سُن ہو رہے شائد۔۔۔دیکھ ذرا۔۔۔' خالہ نے کہا۔

'بہت ہیں خیال کرنے والے۔۔۔' رانو نے مشراز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور وہیں دروازے میں کھڑی رہی۔

مہرو کس کس کو جواب دیتی۔ اور جواب دیتی بھی تو کیا۔۔۔

....

اسلام آباد

یہ موسم بھی کیا عجیب موسم ہے۔۔ بہت ہی پسند ہے مجھے۔خزاں کے جھڑتے پتے۔ ان پتوں کا رنگ۔۔۔ یہ رنگ دیکھا ہے تم نے؟' اس بوڑھے نے پیچھے مُڑ کر اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

'یاد تو سب رکھتی ہو۔۔۔ میں جانتا ہوں۔' اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

'اس روز جب تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھے۔۔۔تو رہا نہیں گیا۔میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ چھین لوں تمہیں۔اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں ایک لکیر تمہارے نام کی اپنے ہاتھ میں اور اپنے نام کی تمہارے ہاتھ میں کھینچ دوں۔میرے سارے رشتے مجھے حد سے زیادہ پیارے تھے ہاں مگر تم سے تو عشق تھا ناں۔ رسوائی بھی برداشت نہیں اور تمہاری تکلیف بھی۔کیا کرتا۔۔۔قدم آگے بڑھتے ، ہٹتے پھر لڑکھڑا جاتے۔شادی شدہ عورت سے محبت جرم تھا، رسوائی تھی۔مگر میری محبت کے بیج نے کب پنپنا شروع کیا یہ تو قصہ پرانا ہے۔ میں تو خود کو شادی سے پہلے ہی تمہارے نام کر چکا تھا۔معاشرے سے نہ لڑ سکا، کبھی تمہاری عمر آڑے آئی، کبھی ہمارا رشتہ۔رکاوٹیں ڈالنے والے ہمارے اپنے ہی تھے جو ہماری محبت میں گُم ، دنیا کو سہارا بنائے بیٹھے تھے۔سب نے پہلی بات ہی یہ کہی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ایسا ہو گیا تو دنیا کیا کہے گی۔ میں اپنی برادری کو کیا منہ دکھاؤں گی وغیرہ وغیرہ۔ہم تو تھے ہی نہیں۔لوگ تھے بس۔مگر اب بس میں ہوں اور تُم ہو۔'

'اچھی لگتی ہو مسکراتی ہوئی۔۔۔یوں ہی مسکراتی رہا کرو۔' وہ اس کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

'نانا جی۔۔۔ نانا جی۔۔۔' ایک چہکتی ہوئی آواز سے دو بچے کمرے میں داخل

ہوئے۔

'کتنی بار کہا ہے کہ پہلے دروازے پر دستک دیا کرو۔۔۔' حبا نے ان کے پیچھے آتے ہوئے کہا۔

'نانا جی کو سرپرائز کیسے دیتے؟' میکائل نے کہا۔

'نانا جی کہتے ہیں کہ جن سے محبت کی جاتی ہے ان کی آہٹ سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ آس پاس ہیں۔' ماہرو نے کہا۔

'ابا جی۔۔۔آپ کی محبت کی داستاں بچوں نے رٹ لی ہے۔' حبا نے کہا۔

'یہ داستان نہیں ہے ماما۔۔۔۔ یہ ماں جی اور نانا جی کے محبت کے اصول ہیں۔ انہوں سے محبت نہیں کی بلکہ ایک دوسرے سے محبت کرنا سیکھا ہے۔۔۔' میکائل نے کہا اور کمرے میں قہقہے گونج اٹھے۔

....

لاہور

لندن سے واپسی پر پاکستان میں اس کو کافی تبدیلی نظر آئی۔

'یہ تو ویسا ہے ہی نہیں جیسا میں اس کو چھوڑ کے گئی تھی۔ بدلاؤ تو آ ہی جاتا ہے۔ کون بھلا کب ایک سا رہتا ہے۔ وقت، جگہ نہ انسان۔ یہی جگہ تھی جہاں ہم نے وقت گزارا۔ یہی سڑکیں، یہی پانی، درخت، باغ۔۔۔ آسمان بھی وہی گا جس کے سائے تلے میں نے تم سے محبت کا اعتراف کیا تھا۔۔۔۔۔۔' تم میری آخری محبت ہو۔۔۔' پہلی کا تو دعویٰ نہیں کرتی۔ جانے انجانے میں کوئی نہ کوئی، کچھ نہ کچھ دل کو بھا جاتا ہے۔ ہاں مگر جب سے ہوش سنبھالا ہے، خیال کی دنیا میں قدم رکھا ہے، تم ہی کو دیکھا۔ تمہارے سکیچ آج تک بناتی ہوں۔ مصوری نہیں آتی، شاعری نہیں آتی، مگر کوئی

بھی نظم پڑھتی ہوں تو یہی گماں ہوتا ہے کہ شاعر نے مجھے اور تمہیں سوچ کہ ہی لکھی ہو گی یا یوں کہہ لو میری تم سے محبت سے تحریک لے کر لکھی ہو گی۔ پنسل سے کاغذ پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر تم سے محبت کے جذبات رقم کرتی ہوں کیونکہ تصور میں تم ہو تو مصور کی تصویر میں بھی تم ہی بنو گے۔'

'باجی۔۔۔یہ یہاں کا پوسٹ آفس ہے۔۔۔' ڈرائیور نے نازلی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

'پوسٹ آفس۔۔۔وہ ایک اور خیال میں گُم ہو گئی، خط بھی لکھا تھا تمہیں۔۔۔ جواب ہی دے دیتے۔۔۔کیا تھا۔میں خوش ہو جاتی۔ ہاں مگر تمہیں میری خوشی کی کیا پرواہ۔۔۔؟ تم نے سوچا ہو گا کہ کہیں پھر سے خط و کتابت نہ شروع ہو جائے۔۔۔ارے نہیں۔۔۔محبت میں بھیک نہیں مانگتے۔نہ تم نے کھل کے کچھ کہا، نہ میں نے سمجھنے کی کوشش کی۔ہاں بہت سوچا، بہت کچھ۔۔۔۔یہاں سے جاتے ہوئے بہت روئی بھی تھی۔ بہت زیادہ۔ابا سمجھ فوراً سمجھ گئے کہ کیا معاملہ ہے۔ کہنے لگے جیسے محبت میں شرک جائز نہیں ویسے ہی محبت میں زبردستی بھی گناہ ہے۔ یہ کیا کہ کسی کا دل تم سے جڑا نہیں اور تم اس سے تعلق توڑنا ہی نہیں چاہتی۔دل کا تعلق نہ جُڑ سکا تو نہ سہی، روح کا تعلق جوڑ لو۔ محبت میں رشتہ داری نہیں ہوتی۔محبوب محبت قبول کر لے تو سو بسم اللہ، نہ کرے تو رکو نہیں، جھکو نہیں، سر اٹھا کے فخر سے بس نچھاور کرتے جاؤ۔محبوب نہیں بنتا تو نہ سہی، پیر بنا لو۔۔۔سمجھو۔۔۔۔تب سے آج تک پیر مان لیا ہے۔'

'یہاں سے لفٹ ٹرن کرنا ہے۔۔۔' اس نے ڈرائیور کو کہا۔

'باجی۔۔۔گھر نہیں جانا؟' ڈرائیور نے پوچھا۔

'نہیں۔۔۔' اس نے جواب دیا۔

....

لاہور

گاڑی ایک تنگ گلی میں آ کر رُکی۔وہ چُپ چاپ ایک دوکان کی سیڑھیاں چڑھ گئی اور وہاں جا کر بیٹھ گئی۔ایک نوجوان لڑکا آیا اور پوچھا میڈم کیا لیں گی؟'

'لسی۔۔۔وہ بھی دو پیڑوں والی۔۔۔' اس نے جواب دیا۔

'جی۔۔۔ابھی لایا۔۔۔' اس نے کہا اور چلا گیا۔

اتنے میں ایک جوان، قدآور مرد وہاں آ کھڑا ہوا اور مزدور سے کچھ بات کرنے لگا۔مزدور کو فارغ کرتے ہی کونے میں لگے شیشے کے پاس جا کھڑا ہوا اور جیب سے کنگھی نکال کر بال بنانے لگا۔نازلی جو عمر کا ایک اچھا حصہ باہر گزار آئی تھی۔چہرے پہ جھریاں تھیں مگر دلکشی ابھی بھی برقرار تھی۔

'سنو۔۔۔تم گڈو ہوناں؟ نازلی نے اس سے پوچھا۔

پہلے وہ تھوڑا ججھکا اور پھر کہنے لگا، میرا نام گلفام ہے۔گڈو تو میں بچپن میں تھا مگر آپ کو کیسے پتا؟

'تمہارے بال بنانے کا انداز، جب تم بال بناتے تھے تو کہتا تھا دیکھو۔۔۔کتنے پیار سے اپنے بال سنوارتا ہے جیسے کوئی اپنی محبوبہ سنوارے۔' اس نے کہا۔

'آپ نازلی باجی ہیں؟' گڈو نے کہا اور کرسی قریب کر کے وہیں بیٹھ گیا۔

'بھائی جی آئے تھے، بھابھی جی بھی ساتھ میں تھیں۔پرانی بات ہے۔تب ابھی یہ دکان بن رہی تھی۔بس کچھ دیر بیٹھے اور چلے گئے۔میرا چھوٹا لڑکا یہی ہوتا تھا، کہتے اس کو بس سکول بھیجنا۔باقی میری ذمہ داری ہے۔اب وہ کالج میں ہے۔پچھلے سال کہا کہ تایا جی کو کہو اب پیسے نہ بھیجا کریں۔میں ٹیوشن پڑھاؤں گا۔فیس ادا کر دوں گا۔اب کسی اور منے کو پڑھائیں۔کہہ رہے تھے بس پڑھاؤ۔نوکری کا مسئلہ ہو تو بتانا' گلفام عرف گلو نے بتایا۔

’کیسا تھا؟ جب وہ آخری بار آیا۔۔۔نازلی نے کہا۔

’پرجائی کے ساتھ آئے تھے۔۔۔ایسے سینہ تان کے آئے تھے جیسے جیسے جنگ جیت کے آئے ہوں۔آنکھوں میں وہی چمک، بلکہ پہلے سے زیادہ تھی۔مُسکراہٹ ابھی بھی ویسی ہی تھی۔‘ گلفام نے بتایا۔

’تم نے مجھے کیسے پہچانا؟‘ نازلی نے پوچھا۔

نوجوان لڑکا لسی کا گلاس ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔

’پھر کبھی آئیں گی تو بتاؤں گا۔ابھی لسی کا مزہ لیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں گُڈو تھا۔آپ نے مجھے بہت تنگ کیا اور میں بھی کتنا پاگل تھا۔غصہ کر جاتا تھا فوراً۔اب سمجھ آتی ہے۔۔۔آپ دونوں کا پیار تھا۔لاڈ کرتے تھے مجھ سے۔‘ گلفام نے کہا۔

وہ اس کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ ماضی کے جھروکے بھی کیا عجیب ہوتے ہیں۔پل بھر میں حال کو تہس نہس کر کے کئی سال پیچھے لے جاتے ہیں جہاں سے چھٹکارا پانے کے لئے آپ دردر کی خاک چھان کے آئے ہوتے ہیں۔

....

رسول آباد

’شکر ہے تو آیا،تُو نے بھی پلٹ کر بیوی کا پتہ کیا۔‘خالہ نے نوید کو کہا۔

بس خالہ، وقت ہی نہیں تھا۔اور میں رن مُرید نہیں۔میری بیوی کوئی حسین پری ہوتی تب بھی رن مُریدی نہ کرتا۔اس جیسی تو۔۔۔‘وہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

’تُو سنا رانو۔۔۔کیسی ہے؟ حسین پری کا ذکر ہوتا ہے تو۔۔۔تیرا نام ہی ذہن میں آتا ہے۔‘نوید نے رانو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

’جا کے چائے پانی کا بندوبست کر۔۔۔تجھے خود پتہ ہونا چاہئے۔کوئی مہمان

آئے تو خود اٹھ جایا کر۔۔۔' خالہ نے رانو کو گھورتے ہوئے کہا۔

'میں مہمان نہیں ہوں خالہ۔۔۔گھر کا ہی ہوں۔۔۔' نوید نے کہا۔

'جا مہرو کو لے آ۔۔۔' خالہ نے کہا۔

رانو منہ بسورنے لگی۔

'بیچاری کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ شکر ہے تو آیا۔ یاد کرتی ہوگی تجھے۔' خالہ نے کہا۔

'جن کو فکر تھی وہ آئے اور مل بھی گئے۔' رانو نے کہا۔

'یہ سارے ناٹک ہوتے ہیں عورتوں کے۔ صرف مرد کی ہمدردیاں اور توجہ لینے کے لئے۔ دنیا کی ساری عورتیں بچہ جنتی ہے یہ انوکھی تو نہیں۔' ساتھ ہی اس نے رانو سے تائید چاہی۔' کیوں رانو۔۔۔ٹھیک کہا نا؟'

'تجھے کہا کہ جا مہرو کو لے آ۔ سنتی نہیں ہے تو۔' خالہ نے کہا۔

'وہ چھت پہ کتابیں پڑھ رہی ہیں۔' رانو نے کہا۔

'اس نے بڑا ایم بی بی ایس کرنا ہے۔' نوید نے قہقہہ لگایا۔ رانو نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

'یہ کتابیں آئیں کہاں سے؟' نوید نے پوچھا۔

'وہ مشراز ہے ناں۔۔۔وہ لایا ہے۔ میرا لاہور والا خالہ کا بیٹا۔' رانو نے بتایا۔

'وہ یہاں آیا تھا؟ کیوں خالہ؟ ایک تو خالو اکثر شہر ہوتے۔ پھر تیری اتنی پیاری جوان بچی ہے۔ میری بیوی بھی یہاں ہے۔ مجھے پسند نہیں خالہ۔ آنے کیوں دیتی ہے تو؟' نوید نے کہا۔

'نہیں پسند تو لے جا بیوی کو۔ دیکھ نوید سیدھی بات کروں گی۔ میرا گھر ہے اور وہ میری سگی بہن کا بیٹا ہے۔' خالہ نے کہا۔

'لگتا یہی ہے۔۔۔'نوید نے کہا اور مہرو کو آواز دی۔

'چلیئے باجی۔آپ کے اصل مجازی خدا آئے ہیں۔جایئے۔۔۔ان کا پارہ بڑھ رہا ہے۔'رانو نے کہا۔

'یہ تم مجھ سے کیسے بات کر رہی ہو؟'مہرو نے کہا۔

'جیسے کرنی چاہئے۔آپ کے اور مشراز میں جو چل رہا ہے، میں سب جانتی ہوں۔سلمٰی سب بتا چکی ہے وہ بہت بار آپ دونوں کو ساتھ دیکھ چکی ہے۔آپ جانتی ہیں ناں کہ سب کیا چاہتے ہیں پھر بھی آپ نے میرے مشراز پہ ڈورے ڈالے۔'رانو نے کہا۔

'یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟ کس نے سکھائیں یہ باتیں؟'مہرو حیرانی سے پوچھنے لگی۔

'میں نیچے جا رہی ہوں۔آپ بھی آ جایئے۔بالکل صحیح سُلوک کرتے ہیں نوید بھائی آپ کے ساتھ۔'رانو نے کہا۔

مہرو ساکت کھڑی اس کو دیکھتی رہی۔

رانو نیچے جاتے ہی کہنے لگی،'میں ان کو کہہ آئی ہوں کہ نوید بھائی بہت پیار سے آپ کو لینے آئے ہیں۔تیار ہو جائیں۔۔۔'اور وہ نوید کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

'پہلے میں رانو سے پوچھوں گی کہ وہ جانا چاہتی ہے یا نہیں؟'خالہ نے کہا۔

'ابھی تو ہی کہہ رہی تھی کہ لے جا اور تو اس سے پوچھے گی؟ میری بیوی ہے، میری مرضی!'نوید نے اعلان کرتے ہوئے کہا۔

'ہاں پر میری بیٹی بھی ہے، اس کی خوشی اور اس کا آرام دیکھوں گی پہلے۔'خالہ نے کہا۔

'مرضی تو میری چلے گی!'نوید نے کہا۔

اتنے میں مہرو چھت کی سیڑھیاں اترتی نیچے آ رہی تھی۔

'لو آ گئیں۔۔۔' رانو نے کہا۔

'بیٹا تو بتا۔۔۔ میں تو کہتی ہوں کچھ دن اور آرام کر لے۔' خالہ نے مہرو سے کہا۔

'تیار ہو اور آ میرے ساتھ۔۔۔' نوید نے کہا۔

'جی ٹھیک ہے۔' مہرو نے نوید کو جواب دیا۔

'کوئی زبردستی نہیں ہے۔۔۔ رُک جا۔۔۔ طبیعت سنبھلے تو چلی جانا' خالہ نے کہا۔

'آپ کا جانا ہی بہتر ہے، لڑکیاں اپنے گھر میں، اپنے ہی شوہر کے ساتھ اچھی لگتی ہیں۔' رانو نے کہا۔

'تجھ سے کسی نے مشورہ نہیں مانگا۔ خاموش رہ۔' خالہ نے رانو کو جھڑکتے ہوئے کہا۔

مہرو اندر جا کر تیار ہونے لگی۔

خالہ اس کے پیچھے کمرے میں گئیں۔

'بیٹا۔۔۔ پکی بات ہے کہ تو جانا چاہتی ہے؟' خالہ نے پوچھا۔

'جی خالہ۔۔۔ جانا بہتر ہے۔ میں خوش ہوں' مہرو نے کہا۔

'شکر ہے سمجھ گئیں آپ۔' رانو نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

'اب ایک لفظ نہ بولنا رانو۔ تجھے کوئی حق نہیں۔' خالہ نے کہا۔

'سارے حق تو انہی کے ہیں ناں۔ اپنے شوہر کو خوش رکھ نہیں سکتیں، دوسروں کے پہ ڈورے ڈالتی ہیں۔' رانو نے کہا۔

خالہ نے رانو کو ایک تھپڑ رسید کیا۔

'اماں۔ آپ کو بھی پتہ چلے گا تو آپ کا دل کرے گا ان کو گھر سے نکال دیں۔

آپ کی بیٹی کے ہونے والے شوہر اور آپ کے لاڈلے بھتیجے کے ساتھ ان کا چکر ہے۔' رانو نے کہا۔

'نہیں یقین آتا تو سلمٰی سے پوچھ لیں۔' رانو نے مزید کہا۔

'بکواس بند کر۔ اس کا شوہر نیچے بیٹھا ہے اور تو کیا کہہ رہی ہے۔ آہستہ بول۔' خالہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

'تبھی تو یہ مجھے مشراز کے قریب نہیں جانے دیتے۔ مجھے اتنی لمبی لمبی تقریریں اور خود ان تقریروں کی آڑ میں۔۔۔ یہ سب۔۔۔ یہی ہے میری خوشیوں کی دشمن۔!' رانو رونے لگی۔

اتنے میں نوید دروازے پہ آ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

'کون ہے ہماری رانو کی خوشیوں کا دشمن؟'

'کچھ نہیں۔ کیا بتائیں آپ کو۔ آپ کی بیوی۔۔۔' وہ کچھ کہنے لگی۔

خالہ نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا، 'جذباتی ہے زرا۔۔۔ تو مہرو کو جاتا دیکھ نہیں سکتی۔'

'روئے تیرے دشمن۔ تو بھی ساتھ چل۔' نوید نے کہا۔

'آمین۔' رانو نے بلند آواز میں کہا۔

'کچھ عورتیں دوسروں کا گھر برباد کرتے ذرا بھی نہیں سوچتیں۔۔۔' رانو نے کہا۔

'سر پھری ہے یہ لڑکی۔۔۔ چلو کھانا لگاتی ہوں۔۔۔ آ جاؤ سب۔' خالہ نے کہا۔

'کوئی بات ہے تو بتا دے رانو۔ تیرا اپنا ہی ہوں۔' نوید نے کہا۔

'کچھ نہیں۔۔۔ بس مہرو باجی اپنے گھر کو جائیں۔ یہی خوشی اور سکون ہے۔' رانو نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

'کہتی ہے تو مان لیتا ہوں۔' نوید نے کہا۔

....

گوکھوال (فیصل آباد)

دن گزرتے گئے، زلیخا کی عادت سی ہوگئی۔ بی بی صاحبہ کا حکم تو تھا مگر اس نے اپنی جگہ بھی بنا لی تھی۔ بس مجازی خدا، مجازی خدا کہتی رہتی تھی۔ ایک دن کہنے لگی، 'غلام حیدر۔۔۔ ایک بات کہوں۔۔۔' میں نے کہا، 'بھلئے لوکے، اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے؟ کہہ دے۔

کہنے لگی، تُو یہاں ہو کے بھی یہاں نہیں ہوتا۔ تیری آنکھیں سب بتا دیتی ہیں۔ ایک انتظار ہے ان آنکھوں میں، ایک امید ہے، آس کا دیا جلتا رہتا ہے۔' میں نے کہا اور ہنسنے لگا۔

'بتا دے۔ کوئی تو بات ہے۔' زلیخا نے اصرار کیا۔

'پاگل نہ بن۔ اصرار نہیں کرتے، ضد نہیں کرتے۔ جو چھپا ہوا ُسے چھپا رہنے دیتے ہیں۔ کھوج میں کیوں جانا، ہوسکتا ہے اس کا چھپا رہنا ہی بہتر ہو۔' میں نے کہا۔

'مگر میرے ذہن میں ایک خیال بار بار آتا ہے کہ آخر ایسا کیا ہے جو تجھے یہاں ہو کر بھی یہاں کا رہنے نہیں دیتا۔' زلیخا نے کہا۔

بیوی تھی میری، گھر والی، اس کو نہ بتا کر ناانصافی تو کر رہا تھا پر کیا کرتا۔ میں نے کہا 'کچھ نہیں اور نظریں جھکا لیں۔'

'تیرا حکم سمجھ کہ کچھ نہیں کہتی۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ لے خاموش ہوگئی۔' اور وہ ہنسنے لگی۔

'لگتا ہے آپ کی گرویدہ تھیں زلیخا بیگم۔' مشراز نے ہنستے ہوئے کہا۔

'گرویدہ۔۔۔' بابا چراغ ہنسنے لگا۔

'چلو، یہ قصہ بھی آج بتا تا ہوں۔' کہتی تھی کہ غلام حیدر۔۔۔ میرا کیا تھا۔ مجھے کون اپناتا۔۔۔ ہم ٹھہرے کمی کمین۔۔۔ اور میں گھر سے بھاگی ہوئی۔ وجہ کوئی بھی ہو۔۔۔ کس

کو غرض ۔۔۔لوگ ذلیل کرنا جانتے ہیں، نقص نکالنا جانتے ہیں۔۔۔۔عزت کوئی نہیں دیتا۔ پتھروں سے بچ کر نکلے ہوئے انسان کو پھر سے سنگسار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معلوم نہیں ایسی کون سی نیکی سرزد ہوئی کہ خدا نے تجھے عطا کیا۔کوئی بڑی نیکی کی ہوگی۔ تجھے ایسے ہی تو مجازی خدا نہیں کہتی۔ خدا مانتی بھی ہوں۔ وہ تو رب ہے جس نے میری نیکی کا اتنا بڑا اجر دیا۔تو میرا زمین پہ وارث ہے۔کیا عشق سے آگے کا کوئی درجہ ہوتا ہے غلام حیدر؟

میں ہنسنے لگا۔ میں اس کو کیا جواب دیتا کہ عشق سے آگے کا کیا درجہ ہوتا ہے؟ پھر تو روحوں کی باتیں ہوتی ہیں۔پھر تو وہ باتیں ہوتی ہیں جو سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں'

'نہیں بابا۔۔۔ہم نہیں سمجھیں گے تو کون سمجھے گا۔ مجھے لگتا ہے کسی سے بے جا محبت ایسے ہے کہ اس کو ہم خود ہی عشق کا درجہ دیتے چلے جاتے ہیں۔حاصل چاہے کچھ نہ ہو مگر یہ اعزاز ضرور ہوتا ہے کہ فلاں فلاں کا دیوانہ ہے۔آپ اس کی نسبت سے پہچانے جاتے ہو۔'مشراز مزید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر بابا چراغ دین نے اس کو ٹوک دیا۔

'یہ میں نہیں بتاؤں گا کیونکہ کچھ باتیں وقت کے ساتھ ساتھ کھلتی ہیں۔وقت ہی ان کو سامنے لے کر آتا ہے۔کچھ گتھیاں خود ہی سلجھتی ہیں اور کچھ سلجھائی جاتی ہیں اور ایک کھلی کتاب کی صورت میں سامنے آجاتی ہیں۔

....

لاہور

'اس نے کتنی جلدی مجھے پہچان لیا۔'نازلی نے خود سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔

'پہچانا بھی تو کیسے؟ مجھے معلوم تھا کہ مشراز تم اس کو ضرور لے کر جاؤ گے۔کیا تم نے مجھے یاد کیا ہوگا؟ یا تم نے اس کو میرے بارے میں بتایا ہوگا؟ مجھے لگتا ہے بتایا ہوگا۔'

وہ ہنسنے لگی۔

'بی بی جی چائے لان میں رکھوادی ہے۔صاحب کے دوست اپنی فیملی کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔' ایک باریک آواز نے اس کو خیالوں کے بھنور سے نکالا۔اس کی آواز باریک سی، کانپتی ہوئی تھی مگر دکھنے میں جوان اور کم عمر نوجوان لڑکی تھی۔کالے گھنے بالوں کی لمبی چٹیا کی ہوئی تھی۔ پراندہ لٹک رہا تھا۔ دوپٹہ کمر سے باندھا ہوا تھا۔

'سنو تمہارا نام کیا ہے؟ میں بھول گئی ہوں۔' نازلی نے پوچھا۔

'بی بی جی مجھے پارو کہتے ہیں۔' اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

'تم کس گاؤں سے ہو؟'۔نازلی نے پوچھا۔

'فیصل آباد کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔آپ نے نام شائد ہی سُن رکھا ہو۔' وہ شرماتے ہوئے کہنے لگی۔

'کیا تمہارے گاؤں میں کوئی کنواں ہے؟ رہٹ چلتا ہے وہاں؟ گنے بھی ہوں گے اورتو اور دربار بھی ہوں گے جہاں دیئے جلتے ہوں۔ میلے لگتے ہوں۔نہر بھی چلتی ہوگی۔ لوگوں کی زمینیں ہوں گی اور شام کو سب کسی ایک درخت کے نیچے جمع بھی ہوتے ہوں گے۔ جہاں۔۔۔طرح طرح کے قصے بیان کئے جاتے ہوں گے۔کسی کا انوکھا لاڈلا لاہور سے پڑھ کے آیا ہوگا جس کو دیکھنے سب چھت پر چڑھ جاتے ہوں گے۔ ہیں ناں؟' نازلی نے کہا اوراس کی آواز ڈگمگانے لگی۔آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

وہ لڑکی نازلی کے قریب آئی اور پوچھنے لگی 'کیا آپ کو گاؤں بہت پسند ہے؟' ابا بتاتے تھے کہ صاحب کی بیٹی ہر وقت ان سے گاؤں کی باتیں کرتی رہتی ہے، وہاں کے لوگ کیسے ہیں، وہاں کا ماحول کیسا ہے؟ کیا آپ کو شوق تھا کہ آپ گاؤں میں رہیں؟' پارو نے پوچھا۔

'کسی گاؤں والے نے بہت ذکر کیا گاؤں گا۔۔۔گاؤں یاد رہ گیا۔ ہر گاؤں اس

کا گاؤں لگا اور ہر وہ گھنا درخت اس کے گاؤں کا سایہ دار درخت لگا۔ ہر وہ منڈیر وہی لگی جہاں سے اس کو دیکھ کر اس کی باتیں ہوں۔' نازلی نے ایک گہرا لمبا سانس لیا۔

پاروان باتوں سے گھبرا گئی کیونکہ وہ باتیں اس کی نظر میں بے معنی تھیں۔ مگر نازلی کی زندگی کا حاصل وہی باتیں اور یادیں تھیں۔

'تم جاؤ۔۔۔ انکل لوگوں کو کہو۔ میں آ رہی ہوں۔' نازلی نے پارو سے کہا۔

'اُف مشراز، یہ کیسا غم دیا ہے۔ اتنا گہرا گھاؤ۔۔۔ مگر تازہ آج بھی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی درخت کے سائے میں آج بھی بیٹھے ہو گے۔ یا ہر درخت تمہیں سایہ دینے کو تیار کھڑا ہو گا۔ تمہارا خط آج بھی پڑھوں تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آدھی ملاقات نہ ہو بلکہ مجھ سے کوئی ہمدردی کا بیج بو کے اسے پانی دیئے بغیر چلا گیا ہو۔ اور وہ خود ہی اتنا مضبوط اور تناآور درخت بن جائے۔ اور درخت بھی کون سا۔۔۔۔ وفا کا۔۔۔!'

....

گوکھوال (فیصل آباد)

'غلام حیدر!' زلیخا نے کوئی خواب دیکھا اور ایک دم چیخ مارتے ہی اُٹھ گئی۔

غلام حیدر کمرے میں موجود نہیں تھا۔ باہر کا دروازہ کھلا تھا اور برآمدے میں لالٹین لٹک رہی تھی۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو باہر فرش پر غلام حیدر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کمرے میں گئی، اپنی چادر پکڑی اور دبے قدموں باہر جانے لگی۔ حُجرے کے دروازے پر رُکی اور باہر کا نظارہ کرنے لگی۔ آنکھیں بند کر کر رات کی تاریکی اور خاموشی محسوس کرنے لگی۔ یہ احساس بالکل ویسا ہی تھا کہ جیسے چند لمحے پہلے زلیخا نے خواب دیکھا تھا۔ پھر اس نے اسی طرح غلام حیدر کو آواز دی۔ وہ دروازے کی چوکھٹ پر حواس باختہ کھڑی تھی۔ وہ ہمت کر کے آہستہ آہستہ غلام حیدر کی طرف بڑھی اور کہنے لگی، 'غلام حیدر! کوئی دنیا کی فکر کر لے۔ میں کب

سے تجھے بُلا رہی ہوں۔تو رات کے اس پہر ہر شے سے بے خبر یہاں۔۔۔احاطے میں بیٹھا ہے۔تُو دن بدن مجھ سے کیا، دُنیا سے بھی دور ہوتا جا رہا ہے۔کون سی چیز ہے جو تجھے پریشان کئے ہوئے ہے۔ مجھے چھ ماہ ہوئے ایک خواب مسلسل دیکھ رہی ہوں۔غلام حیدر، کچھ تو بتا کہ یہ ماجرہ کیا ہے؟'۔

وہ اپنی دُھن میں ہمیشہ کی طرح بولے جا رہی تھی۔

'میں پھر اسی کنویں کے پاس کھڑی ہوں۔ہاں وہی کنواں جہاں آس پاس بہت سے کھیت ہیں۔کوئی شخص تیز تیز قدم اٹھاتا اس کنویں کے پاس سے گزرتا ہے۔ کنویں کے گرد ڈھیر سارے پانی کے پیالے اور دانے پڑے ہیں۔چاند۔۔۔بالکل ایسا ہی ہے۔پورا چاند۔۔۔آج چاند کی تاریخ کون سی ہے؟ بتا ناں۔۔۔بول۔۔۔نہیں بولے گا، ایسے ہی رہے گا تو لوگ تجھے مجنوں کہیں گے، دیوانہ کہیں گے۔پاگل کہلائے گا۔۔۔کچھ تو بول۔

'چودہ۔۔۔'وہ سسکنے لگا اور ساتھ ہی چاند کو دیکھنے لگا۔

'ہاں چودہ ہی ہے۔۔۔'زلیخا نے کہا۔

'کوئی شخص رات کی تاریکی میں لالٹین لئے چلتا جاتا ہے۔۔۔چلتا جاتا ہے۔۔۔دیوانہ سا ہے، مجنوں سا۔۔۔رات کی تاریکی ہے گھُپ اندھیرا ہے۔آس پاس کوئی نہیں۔مگر آوازیں آتی ہیں۔کہ دیکھو دیوانہ پھر جا رہا ہے۔معلوم نہیں کہاں جاتا ہے۔مگر تین دن بعد آئے گا۔وہ پہنچتا ہے تو قبروں کے ڈھیر میں ایک قبر ہوتی ہے۔گلاب کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی۔معلوم نہیں کہ کس کی قبر ہے۔وہ مجنوں کون ہے؟؟ زلیخا رونے لگی۔

'میرے غلام حیدر کچھ تو بول۔'زلیخا اس کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے۔غلام حیدر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کہ رونے لگتا ہے۔زار و قطار رونے اور کہتا ہے کہ جا۔۔۔اندر

جا۔۔۔چلی جا۔

زلیخا چپ چاپ اٹھ کہ اندر چلی جاتی ہے۔

....

اسلام آباد

'یہ بچے بھی ناں، رونق بنائے رکھتے ہیں گھر میں۔ یہ نہ ہوں تو سنسان رہتا ہے سب۔ ہیں ناں؟ اس بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

'یوں ہی تم بھی مسکراتی رہو۔ تمہاری مسکراہٹ دیکھنے کو ہی اتنا لمبا سفر کرتا تھا' وہ ہنسنے لگا۔

ایک چڑیا پھڑ پھڑاتی ہوئی کمرے کی کھڑکی میں آ بیٹھی۔

'نمی دانم کہ آخر چوں کہ دیدار می رقصم
مگر نازم بایں ذوقے کہ پیشِ یار می رقصم'

جانتی ہو کہ یہ شعر کس نے میرے سامنے پڑھا تھا۔۔۔وہ بوڑھا یہ شعر اونچا اونچا دُہرانے لگا۔ مجھے معلوم ہے سمجھ گئی ہوگی۔ بابا چراغ دین نے۔ اس کا مطلب ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ آخری دیدار کے وقت میں کیوں رقص کر رہا ہوں، مگر اس ذوق پہ ناز ہے مجھے کہ اپنے یار کہ سامنے میں رقص کر رہا ہوں۔۔۔می رقصم!

نہیں واقف کہ آخر کیوں دم دیدار ہوں رقصاں
مگر اس سوچ سے خوش ہوں حضورِ یار ہوں رقصاں

وہ اپنی بیوی سے بات کرتے کرتے اسی سال، اسی لمحے میں کھو گیا جب وہ بابا چراغ دین کے ساتھ کنویں کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ بابا چراغ دین می رقصم، می رقصم کہنے لگا۔

میں۔۔۔وہ میں ہی تھا جوان کے عشق میں رقص کناں تھا۔ چودھویں کی رات تھی۔ زلیخا میرے مجبور کرنے پہ اندر کمرے میں جا چکی تھی۔ میں اکیلا زمین پر بیٹھا، اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسی طرح بابا چراغ دین، بات کرتے کرتے بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ حق۔۔۔حق۔۔۔

عشق میں رقص کرنے کو محبوب کے سامنے ناچنا تو نہیں کہتے۔ حق حق کی فضا بلند کر رہا تھا۔ وہ رقص وصال کا تھا یا ہجر کا۔۔۔ معلوم نہیں۔ وہ خاموش ہو گیا۔ وہ رات، میں کبھی نہیں بھول سکتا وہ رات۔ میرا محبوب اس رات روٹھ کر جا چکا تھا۔ اس دن جب بی بی صاحبہ نے ہاتھ پھیلائے، مجھے یوں لگا کہ ہجر کی گھڑیاں جلد آنے والی ہیں۔ بی بی صاحبہ بھانپ گئیں اور مجھے خاموش رہنے کو کہا۔ میں کیا کرتا، خاموش رہا۔ حکم تھا بی بی صاحبہ کا اور مُرشد کا حکم نہیں ٹالتے۔ کبھی بھی نہیں۔ میں خاموش رہا۔ جیسے جیسے بی بی صاحبہ کا وقت قریب آتا گیا۔ میں خاموش ہوتا گیا۔ میری زبان بند ہوتی گئی۔ میرا دل دنیا سے اُچاٹ ہو گیا۔ زلیخا بہت قدر کرتی تھی میری۔ بہت فکر رہتی تھی اس کو میری۔ اس کو بھی میرے گُم سُم ہونے کا دکھ اندر ہی اندر کھا گیا۔ بی بی صاحبہ کے رخصت ہونے کے بعد میں نے زلیخا کو کہا۔۔۔ مجھے اجازت دے، میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔۔۔ بی بی صاحبہ کے بعد میرا یہاں دل نہیں لگتا۔ مجھے معاف کر دے اور خوشی سے اجازت دے۔ میں جانتا ہوں کہ تیرا مجرم ہوں اور رہوں گا پر اس پہ میرا اختیار نہیں۔' میں نے زلیخا کے سامنے سر جھکا دیا۔ کچھ دیر خاموش رہی اور اچانک اس خاموشی کو اس کی سسکیوں نے توڑا۔ پھر کچھ سنبھلی اور کہنے لگی، 'غلام حیدر۔۔۔ عورت محبت کرے نا تو وہ اپنے محبوب کو اپنی اسیری میں لینا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ وہ بھی اس سے ویسی ہی محبت کرے اور کرتا رہے۔ عشق ہو ناں تو وہ خود کو اس کی غلامی میں دینا چاہتی ہے۔ خود کو اس کے سپرد کر دیتی ہے۔ عشق کا ہر درجہ پار ہو جائے ناں تو اطاعت شروع ہو جاتی ہے۔ تیرا ہر ظلم عطا لگنے لگا۔' وہ ہنسنے لگی۔

میں جانتا تھا، وہ سب کہہ گئی۔ خاموش رہ کر بھی، سسکیاں لے کر بھی اور بین بھی کر بیٹھی۔ مگر کیا کرتی۔ بس جانا چاہتا تھا سو چلا گیا۔

....

مشراز یہ شعر دُہرائے چلا جا رہا تھا۔

نمی دانم کہ آخر چوں دمِ دیدار می رقصم
مگر نازم بایں ذوقے کہ پیشِ یار می رقصم
تو ھر دم می سرائی نغمہ و ھر بار می رقصم
بہر طرزِ کہ می رقصانیم اے یار می رقصم
تیرے ہر نغمہ پر ہوں وجد میں ہر بار ہوں رقصاں
تیری ہر اک ادا ہر طرز پر اے یار ہوں رقصاں

ناچنا۔ گھنگھرو باندھ کر دھمال کو رقص نہیں کہتے۔۔۔ سفید چوغہ پہن کر گھوم لو۔۔۔ ناں۔۔۔ وہ تو مُرشد کی ہاں میں ہاں ملانے۔۔۔ اس کے ہر اشارے، اس کے ہر حکم کی تعمیل کو کہتے ہیں۔ جب آپ نے حکم دیا کہ جاؤ مشراز، میں کسی اور کی امانت ہوں تو کیسے رُکتا وہاں۔۔۔ کیا کہتا اور رُکتا بھی کیوں؟ بس آپ کی سلامتی کی دعا مانگتا رہا اور آپ کی شوہر کی ہدایت کی کہ اس کو آپ کی قدر آئے۔ اس شخص کو ہیرے کی قدر نہیں۔ خط لکھتا رہوں گا۔ خط آدھی ملاقات ہوتے ہیں ناں۔۔۔ بس یہ ملاقات کرتا رہوں گا۔

یہ الگ بات ہے کہ بنا ارسال کئے، میں یہی سمجھوں گا کہ آپ تک پہنچ گیا۔ میرا دل ہلکا رہے گا، ایسے لگے گا کہ آپ ہر دم یہیں ہیں، کہیں آس پاس۔ قدرت نے یہ ملن ادھورا رکھا ہے۔ مگر بابا چراغ دین کہتا ہے کہ یہ کھیل دنیا کا نہیں۔۔۔ مگر میری محبت اتنی کہاں پہنچی ہوئی ہے۔ جو بات ہجر اور وصال تک جا پہنچے۔ وقت کا کھیل ہے سارا۔۔۔ وقت کبھی آپ کے حق میں ہے تو کبھی آپ کے خلاف۔۔۔

خیالات اور خودکلامی کے اس تسلسل کو گُڑیا نے توڑا۔

'بھائی ۔۔۔آپ کب آئے؟'اس نے پوچھا۔

'صبح سویرے آیا تھا۔'اس نے جواب دیا۔

'مہرو باجی ٹھیک ہیں؟ زیادہ مارا تو نہیں ان کے شوہر نے؟' گڑیا نے پوچھا۔

'فضول باتیں نہ کرو۔ پانی پلادو مجھے۔'مشراز نے کہا۔

'اے پاگل ہوگئی ہے گیا؟ کس سے باتیں کررہی ہے؟' ماں نے آواز دی۔

'بھیا آیا ہے ماں۔' گڑیا نے جواب دیا۔

ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔

لگتا ہے اماں ابھی تک ناراض ہیں ۔۔۔' گڑیا نے کہا۔

'گڑیا۔۔۔پانی ۔۔۔'مشراز نے اسے یاددلایا۔

'اچھابابا۔۔۔مرچیں کھاکے آئے ہوکیا؟ ؟ جارہی ہوں۔' گڑیا نے کہا۔

....

اسلام آباد

سرسبز وشاداب پارک تھا۔ واک کے لئے الگ ٹریک بنا تھا۔کوئی اپنا پالتو جانور لئے چہل قدمی کے لئے آیا تھا تو کوئی کسی بچے کو ہمراہ لایا تھا،کوئی سہیلی یا دوست کے ساتھ تھا تو کوئی اپنی ہمسفر کے ساتھ۔کوئی بچوں کے ساتھ پُرانی یادیں تازہ کررہا تھا تو کوئی بیوی سے سارا دن کا حال احوال کہہ رہا تھا۔ یہ بینچ سب کا گواہ تھا۔کون آیا، کتنی دیر بیٹھا، کس سے باتیں کیں۔سب اس کو پتہ تھا۔ یہ بھی معلوم ہوگا کہ یہ بوڑھا یہاں اکیلا آتا ہے، بیٹھا رہتا ہے اور چلا جاتا ہے۔اس کی بھی کیا زندگی ہے وہ خود پہ ہنسنے لگا۔ پھر کہا، حیا اور میکال ہوتے تو کہتے ،ناناجی آپ بھی ناں۔۔۔ ہمیشہ اپنے آپ سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ خود ہی

مسکراتے ہیں۔ کہیں آپ کو محبت تو نہیں ہوگئی؟؟' اس نے قہقہہ لگا یا۔

قہقہہ اتنا پُر جوش تھا کہ آس پاس چہل قدمی کرتے لوگوں نے سُنا اور اس کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ ایک عورت دُور کھڑی تھی اس بوڑھے کو دیکھ رہی تھی۔ اس سے قریباً چھ سات برس چھوٹی ہوگی مگر اپنی عمر سے بہت ہی کم عمر لگ رہی تھی۔ وہ بینچ کے پاس آکر رُک گئی اور کہنے لگی، 'مشراز۔۔۔ کب تک خود سے باتیں کرتے رہو گے؟ یوں ہی۔۔۔ اکیلے؟

وہ اس کو دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔ اپنا چشمہ اتارا اور اس کو غور سے دیکھنے لگا۔

'کیا حسین اتفاق ہے۔۔۔' وہ ہنسنے لگا۔

'واقعی۔۔۔ حسین؟؟' اس نے پوچھا۔

'اتنا حسین ہوتا تو۔۔۔' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

'یہ بتاؤ، یہاں اکیلے کیوں آتے ہو؟' اس نے پوچھا۔

'اکیلا نہیں ہوتا۔۔۔' اس بوڑھے نے جواب دیا۔

'مان لو مشراز کہ اکیلے ہو۔۔۔' اس نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

'میرے پاس اسکی یادیں ہیں نازلی۔۔۔ ایسے مت کہو' اس بوڑھے نے کہا۔

'کبھی کبھار جی میں آتا تھا کہ پوچھوں کتنا پیار کرتے ہو اس سے؟ پھر سوچا کہ یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ نظر آتا ہے۔' نازلی نے کہا۔

'مجھے نہیں معلوم کہ لوگوں کو کیا نظر آتا ہے، ہاں مگر مجھے اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

'لوگوں کو بھی یہی لگتا ہے کہ تمہیں اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ابھی بھی اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کیا؟؟ نازلی نے پوچھا۔

'عمر بیت گئی، اس کے سنگ۔۔۔ اس کی یادوں کے سنگ۔۔۔ لگتا ہے ایک

ایک پل اس کے ساتھ ہی گزرا ہو۔ دل مانتا ہی نہیں کہ اب وہ نہیں ہے۔ گُل ۹ برس کی تھی اور میرا مہد پورے چار برس کا۔ اس کی آنکھیں بھیگ آئیں۔ وہ کچھ نہ بول پایا، نیچے سبز گھاس کو دیکھنے لگا۔ گھاس دھندلی تھی۔ بہت دھندلی۔۔۔۔

نازلی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے جی میں آیا کہ خوب سنائے اسے۔ مگر خاموش رہی اور اٹھ کے چلی گئی۔

....

'معلوم نہیں تمہیں سلام پیش کروں، تمہاری لازوال اور بے مثال محبت پر یا دل کی بھڑاس تم پہ نکالوں۔ اتنے برس تم نے تنہا گزارے، اس کے بغیر۔۔۔ ایک بار میرا ہی سوچ لیتے کہ کتنے طویل انتظار میں ہوں میں۔ اس نے قلم اٹھایا اور کاغذ ڈھونڈنے لگی۔ پھر کچھ دیر سوچتی رہی کہ حرفِ ابتدا کیا۔ ہمیشہ کی طرح کئی کاغذ لکھے اور کئی پھاڑے۔ پھر گہری سوچ میں گُم ہوگئی، ایک دم مسکرانے لگی۔

محبوب لکھوں یا ستم گر؟ قاتل لکھوں یا دلدار!!۔ وہ ہنسنے لگی۔

میرے معاملے میں ایک ہی بات ہے۔ جو تم نے کیا وہ کوئی اپنا نہیں کرتا۔ مگر تم اپنے تھے ہی کب؟ تم نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے لئے نہیں بنے۔ مگر تم نے خود سے یہ فیصلہ کیسے کرلیا؟ میری کتاب میں تو تم میرے لئے اور میں تمہارے لئے ہی بنی تھی۔ پھر ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ آج اس خط میں لکھی ہر بات، ہر پیغام، ہر استعارہ غور سے پڑھنا اور بتانا کہ میں کون ہوں۔ نہ جانے تمہیں میری کوئی بھی بات یاد ہوگی بھی یا نہیں، ہاں مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ یاد ہونے والی ہو یا نہ میں بھولنے والوں میں سے بھی نہیں۔ تبھی تم نے مجھے فوراً پہچان لیا ہے۔ یاد ہے کہ جب میں نے تم سے پہلی بار اظہارِ محبت کیا تھا تم نے کہا تھا، نازلی۔۔۔ تم مجھے نہیں جانتی۔ میں نے کہا کہ قدم بڑھاؤ۔ جان جاؤں گی۔ برسوں پرانی دوستی ہے، کسی پہلو سے ناواقف بھی ہوں گی تو کمپرومائز کرلوں گی۔

سمجھوتہ میں ہی خوشی جانوں گی۔لفظ سمجھوتہ سُنتے ہی تم میری طرف دیکھنے لگے جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہو۔ اور کہا، 'نازلی۔۔۔ محبت سمجھوتوں کی قائل کہاں ؟۔۔۔ میں نے کہا مشراز۔۔۔مشراز۔۔۔ میری بات تو سُنو۔تم نے کہا کہ میں ایک ہی ہوں۔دو بار مشراز کیوں کہا؟ پھر مسکرائے اور نظریں پھیر لیں۔ میں نے کہا، بس ایک بار سنجیدگی سے میری بات سُن لو۔میں تو منت سماجت پہ اتر آئی ، کہ جیسے تمہیں پانا میری زندگی کا پہلا اور آخری مقصد ہو۔'

'دیکھو۔۔۔ سمجھوتے محبت میں ہی کئے جاتے ہیں۔ محبت نہ ہوتو انسان سمجھوتہ کیوں کرے؟ پھر تو آگے بڑھے، بغیر کسی تردد کے۔محبت آگے بڑھنے نہیں دیتی ۔پھر دل کرتا ہے کہ سمجھوتہ کرلیا جائے۔'

تم ہنسنے لگے اور کہا، 'نازلی۔۔۔کیسی بچوں جیسی باتیں کرتی ہوتم ؟ سمجھوتہ وہاں ہوتا ہے جہاں کچھ قابلِ قبول نہ ہو۔ جہاں کوئی کمی ہو۔مگر جہاں محبت ہو وہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ تو سن رکھا ہے ناں کہ محبوب کا ہر ستم بھی کرم لگتا ہے تو ستم کو ستم سمجھ لیا تو محبت کہاں رہی؟۔محبوب کے تو کرامات ہی یہی ہیں اور عاشق کا کمال ہی یہی کہ ستم بھی کرم سمجھ کر قبول کرے۔'

میں نے تمہاری بات کاٹی اور کہا، 'مشراز،۔۔۔ دیکھو یہ سمجھوتہ ہی تو ہے۔'

تم نے کہا، 'نہیں نازلی ۔۔۔ یہ سمجھوتہ نہیں ۔ عاشق کو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ ستم سہہ رہا ہے۔ کیونکہ سُن بھی رکھا ہے اور محسوس بھی کیا ہے کہ جو من کو بھا جائے اس کی ہر خامی بھی خوبی لگتی ہے۔وہاں ہم سودا نہیں کرتے کہ چلو خامی کو قبول کرتے ہیں۔'

میں بضد تھی ، اسرار کر رہی تھی مگر تم نے میری طرف دیکھا، مسکرائے اور کہا، 'نازلی۔۔۔ جھگڑا کس بات کا ہے؟' محبت ہے تو ہے نہیں تو نہیں۔۔۔اس میں تیسری کوئی آپشن نہیں۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں۔' وہ الفاظ ایسے تھے کہ کوئی زوردار طمانچہ میرے منہ پر

رسید کر رہا ہو۔ دروازہ تو نہیں دکھاتا مگر کہہ دیتا ہے 'گیٹ آؤٹ۔۔۔'

اس دن سوچا کہ بس جو بھی ہو۔۔۔اب نہیں کہوں گی۔ خاموش رہوں گی مگر محبت کی یہ خوبی ہے کہ ایک بیل کی طرح انسان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ خود خود پھلتی پھولتی ہے۔ آکاس بیل ہے ناں۔۔۔ بالکل ایسے ہی ساری Nutrients خود لے کر شاداب ہو جاتی ہے۔ بالکل ایسے ہی میری محبت نے کیا۔ میں بالکل بے جان تھی۔ ٹوٹ چکی تھی۔ میں شائد محبت کی پیاسی تھی، امی بچپن میں چلی گئیں۔ کبھی نانی تو کبھی بابا۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی اپنا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ میں ٹھکانہ بنانے کا سوچنے لگی۔ تمہارے ساتھ۔ جیسے تم اپنے اصل سے جڑے رہتے تھے ویسے میں تم سے جڑنا چاہتی تھی۔ تم کہیں نہ کہیں شائد میرے ہو جاتے مگر وہ ہمارے درمیاں آ گئی۔ تم اس کے ہو گئے۔ میں پھر بھی تمہاری رہی۔ تمہارے در سے کئی بار دھتکاری گئی مگر محبت کے ماروں کو کہاں سمجھ آتی ہے۔ وہ در کھٹکھٹاتا رہتا ہے کہ شاید کھل جائے۔ نہ بھی کھٹکھٹائے تو نظر وہیں رہتی ہے کہ شاید کوئی خود ہی بھولا بھٹکا کھول دے۔ مگر اس راہ میں بھولا بھٹکا مسافر عاشق ہی ہوتا ہے۔ میں نے سب تقدیر پہ ڈال دیا اور تمہاری زندگی سے نکل گئی۔ مگر تمہیں آج تک نہیں نکال پائی۔ بھلا بتاؤ اگر کبھی میں پوچھوں کہ کیسے ہو؟ تو اس میں کیا گناہ؟ تم بتادو کہ بھلا ہوں۔ ساتھ میں لکھ دو کہ تم کیسی ہو۔ ذرا چھوٹا کر کے لکھ دو مگر لکھ دو۔ تم تو پتھر کے نکلے۔ پتھر پہ بھی قطرہ قطرہ گرتا رہے تو میں سوراخ ہو جاتا ہے معلوم نہیں تمہارا پتھر کتنا پتھر تھا کہ اپنی ضد پہ اڑا رہا۔ جما رہا۔ ڈٹ کے کھڑا رہا۔ کبھی چاہ کہ بھی تم پہ غصہ نہ کر سکی مگر آج بے انتہا غصہ ہے۔ وہ برسوں پہلے اس دنیا سے جا چکی تھی۔ تم نے اس قابل نہ سمجھا کہ اس کے جانے کے بعد ہی تھوڑی جگہ دے دیتے۔ کئی خط لکھے۔ کئی پیغام بھیجے۔۔۔ سو بار پوچھا۔۔۔ کیسے ہو مشراز؟ تم نے ہر بار رسوا کیا۔ میں نے تم سے دوری کے اسباب پیدا کر لئے۔ چھوڑ تو تم چکے تھے مگر اب کی بار میں نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ تم نے سوچا کتنے آرام سے چلی گئی اور دعویٰ کرتی تھی کہ محبت

ہے۔ آرام سے نہیں گئی۔ آرام سے نہیں گئی۔ مجھے ایک ایک لمحہ یاد ہے کہ بہت کٹھن گزارا۔ رات رات بھر نہیں سوئی اگر کبھی آنکھ لگ بھی جاتی تو ایک دم اُٹھ جاتی۔ ایک وقت تو وہ بھی آیا کہ بارش کے قطرے کی طرح برستی۔ جہاں برستی، وہیں تحلیل ہو جاتی۔ بارش کا قطرہ جب سمندر میں گرتا ہے تو وہیں گُم ہو جاتا ہے۔ اسی میں کھو جاتا ہے۔ تم سمندر تھے۔ میں اپنا وجود تم میں گنوا بیٹھی تھی۔

اس نے قلم اسی نوٹ پیڈ پر رکھا اور ساتھ پڑا لیمپ دیکھنے لگی۔

'مجھے وہ دن یاد ہے۔ ابا نے بہت پیار سے بُلایا اور کہا، 'نازلی۔۔۔ میری جان۔ میں جانتا ہوں۔۔۔ تمہاری ماں کے جانے کے بعد میں تمہیں زیادہ وقت نہ دے سکا۔ تم ہاسٹل میں رہی، تم نانی کے ساتھ رہی۔ تم نے بہت وقت تنہا گزارا۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔ ایسے میں انسان محبت کا متلاشی ہوتا ہے۔۔۔ میری بیٹی۔۔۔ میں تمہارا دوست ہوں۔۔۔ ماں کی کمی تو پوری نہیں کر سکا مگر ایک دوست تو بنا رہا۔ بال سفید ہیں۔۔۔ جھریاں بھی ہیں۔ مگر دھوپ میں سفید نہیں کئیے۔ اس بڑے میاں سے کچھ نہ چھپانا۔'

میں حیران ہو گئی کہ یہ ابا کو کیا ہوا۔۔۔ سچ پوچھو تو ڈر بھی گئی۔ پھر ہمت کی اور کہا، 'میں سچ ہی بولوں گی، آپ پوچھئے۔۔۔' ساتھ ہی ابا کے کاندھے پر سر رکھا۔ تا کہ ان سے نظریں نہ ملا سکوں۔

'تو ہوا کچھ یوں کہ ایک رات، میں دیر سے گھر آیا۔ میں نے دیکھا کہ میری بیٹی ٹیرس پہ کھڑی چاند کو دیکھ رہی ہے۔ مسکرا بھی رہی ہے۔ اکثر یہی دیکھا میں نے۔ رات میں چاند کو دیکھتے رہنا اور مسکرانا۔ یہ بھی دیکھا کہ یہ جھولا۔۔۔ اسکو دیکھ کر تم مسکراتی رہتی ہو۔ کبھی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں تو کبھی ایک دم ہر قسم کی خاموشی اور احساسات کو توڑتا ہوا ایک قہقہہ۔۔۔' یا چلو یوں پوچھتا ہوں کہ کون ہوتا ہے خیالوں میں۔ کس کا گمان کرتی ہو؟ یا یہ خیال کرتی ہو کہ وہ بھی کہیں نہ کہیں چاند کو دیکھتا ہو گا اور مسکراتا ہو گا؟ کیا اس کے دھیان میں

بھی تم ہوتی ہوگی؟؟' ابا نے کہا۔

میں پھر سے مسکرائی، نہ چاہتے ہوئے مسکرائی۔ 'معلوم نہیں ابا۔۔۔'

مجھے سب معلوم ہے۔۔۔ابا نے کہا۔

'یہ جھمیلے یک طرفہ محبت کے ہیں۔' ابا نے کہا۔

'جانتی ہوں ابا۔۔۔' نازلی نے کہا۔

'عشق کی آگ، محبت کا پھول۔۔۔یہ دونوں کے دالان میں لگیں تو پھر خوشیاں ہی خوشیاں ہوتی ہیں۔ چھپانا، مسکرانا، چھٹی لکھنا، انتظار کرنا لگا رہتا ہے۔ جب یک طرفہ ہو تو پھر مرجھائے رہنا، یاس ناامیدی اور انتظار۔۔۔ایک عجب انتظار۔۔۔ناممکن کے ممکن ہونے کا انتظار اور بے قراری لگی رہتی ہے۔اتنا تردد، اتنی تگ و دو۔۔۔ کس لئے بیٹا۔۔۔۔ جو ہے اسے قبول کرو۔۔۔نہیں ہے تو حاصل کرنے کی کوشش کرو اور نہیں کر سکتے تو بس آگے بڑھو۔ مگر یہ کیا وہیں رُک جانا۔ ایک ہی بار ملنے والی زندگی کو گھسیٹ برباد کر دینا۔ایک محبت ناکام ہوئی تو دوسری کرلو۔خود کو وقت تو۔مگر یہ کیا۔۔۔اتنی اذیت۔۔۔اتنی پریشانی۔۔۔'

میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ ابا سے کہا کہ ابا۔۔۔کیا محبت کوئی بزنس ہے کہ ایک میں ناکامی ہوئی تو دوسرا شروع کرلوں۔ یا کھیل ہے کہ ایک بار ٹرافی نہیں ملی تو اگلی بار ایک نئی امید اور نئی تیاری سے کھیلوں۔۔۔محبت میں باریاں نہیں ہیں۔ اب اس کی تو پھر کسی اور کی۔ مجھے تو کئی برس گزرنے کے بعد بھی وہ اپنے ساتھ ہی محسوس ہوتا ہے۔ اس نے کبھی جھوٹی آس میں نہیں رکھا۔ ہمیشہ سیدھا انکار کیا ہے۔اعتراف تو دور کی بات۔ بس اس نے کہا کہ ہم ایسی ندی کے دو کنارے ہیں جو کبھی آپس میں نہیں ملتی۔ میں نے کہا چلو ساتھ چل لیتے ہیں۔ Parallel۔۔۔ بھلے نہ ملیں۔مگر ساتھ ساتھ چلتے تو رہیں گے۔میری محبت ایسی نہیں جو ملن مانگے۔اس کے ساتھ ہی میری محبت کی داستاں ختم ہے۔وہ میری آخری محبت ہے!!!

....

سرگودھا

'چپ کرا دے اس کو۔۔۔ہر وقت روتی رہتی ہے۔جیسے کوئی مر گیا ہو اس کا۔۔۔ماں زندہ ہے تیری۔۔۔ چپ کر۔'نوید پورے گھر میں چلا رہا تھا۔

مہرو بہت خاموشی سے آئی اور بیٹی کو اٹھا کر اس کو بہلانے لگی۔

'بہت احسان کر رہی ہے ناں اس کو اٹھا کر۔۔۔بہت برا شوہر ہوں میں۔یہی سوچ رہی ہے۔'اس نے قہقہہ لگایا۔

'اچھا یا برا شوہر ہونے کی شکایت نہیں کی۔۔۔ذکر بھی نہیں کیا۔۔۔بس اچھے باپ بن جائیں۔مہرو نے ہمت کر کے کہا۔

'تیری یہ ہمت۔۔۔تو زبان چلائے میرے سامنے۔۔۔' ساتھ ہی اس نے ایک زوردار طمانچہ مہرو کو رسید کیا۔مہرو ننھی گڑیا سمیت بیڈ پر گری۔

'اچھا باپ۔۔۔۔کیا معلوم۔۔۔اس کا باپ ہوں یا نہیں۔شکل تو دیکھی نہیں ہے اور معاشقے کتنے چلا رکھے ہیں۔یہ ایک میرے سامنے ہیں۔مجھ سے چھپے پتہ نہیں کتنے ہوں گے۔تو شکر کر کہ تجھے گھر میں جگہ دی ہے ورنہ تیری جیسی عورتوں کو کوئی سڑک پر بھی جگہ نہ دے۔' نوید جلدی سے باہر نکل گیا۔کمرے کا دروازہ لاک کیا گیٹ کو تالا لگایا اور چلا گیا۔رات گئے جب آیا تو بچی کو بہت تیز بخار تھا۔

مہرو دروازہ کھلتے ہی چلانے لگی۔'انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں آپ میں۔آپ نے مارا پیٹا، الزام لگائے، غیر لڑکیوں سے تعلقات رکھے۔میں خاموش رہی۔مگر بیٹی آپ کی ہے۔اس کو ماننے سے انکار نہ کریں۔یہ بخار میں تپ رہی ہے صبح سے۔اندر کمرے میں دودھ ہے نہ دوا۔پانی تک نہیں ہے، مجھے تو کئی کئی دن بھوکا رہنے کی عادت ہے۔مگر یہ معصوم۔۔۔!

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، نوید نے اس کو گردن سے پکڑا اور کہا، 'نکل یہاں سے بہت زبان چل گئی ہے تیری۔ نکل اور اس کو بھی لے جا۔' نوید نے بس اتنا کہا اور اس کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ وہ سردی میں صحن میں بیٹھی رہی۔ یخ بستہ ہوائیں کبھی دائیں چلتی کبھی بائیں۔ وہ کبھی اپنے دوپٹے سے بچی کو ڈھانپتی تو کبھی اپنے ساتھ لگاتی۔ اپنی ممتا کی گرمائش دیتی۔ صبح صبح آذان کی آواز بلند ہوئی۔ پتہ ہی نہ چلا کب دیوار سے ٹیک لگائے اس کی آنکھ لگی۔ آذان کی آواز سے جب آنکھ کھلی تو ننھی گڑیا کو حرکت کرتے نہ پایا۔ وہ کچھ دیر سکتے کے عالم میں اس کو دیکھتی رہی۔

'مانو۔۔۔ مانو۔۔۔ آنکھیں کھولو۔۔۔' وہ ایسے باتیں کر رہی تھی کہ جیسے مانو کوئی بولنے والی گڑیا ہو جبکہ وہ چھ ماہ کی ننھی بچی تھی۔ مانو کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ وہ اپنی ماں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کے جا چکی تھی۔

....

گھر میں ماتم کا عالم تھا۔ مہمان سارے جا چکے تھے۔ مگر خالہ اور رانو وہیں موجود تھیں۔ رانو اور نوید صحن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے جبکہ خالہ اور مہرو برآمدے میں تھے۔ مہرو خالہ کی گود میں ٹکائے لیٹی تھی۔ خالہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ اس کا سہلا رہی تھیں کہ کسی طرح اس کا غم کم ہو جائے۔

'خالہ۔۔۔ وہ میرے جینے کی اُمید تھی۔ وہ آئی تو ایسا لگا کہ جیسے میرے میں جان آ گئی ہو۔۔۔ اس کے سوا میرا تھا ہی کون۔؟' مہرو کہنے لگی۔

'تو نے پھر مجھے پرایا کر دیا۔' خالہ نے گلا کیا۔

'خالہ میں سوچتی تھی کہ میں ہر غم سے آزاد ہوں۔۔۔ اس سے بُرا میرے سے کیا ہو سکتا ہے؟؟ مجھے رب نے بتا دیا کہ میں چاہوں تو کیا کچھ نہیں کر سکتا۔۔۔ یہ سوچا بھی نہ تھا کہ خوشی دینے کے ساتھ ہی پھر دوہرا غم بھی دے گا۔' وہ رونے لگی۔

'خالہ اس کو کہہ یہ منحوست بند کرے، کب تک سوگ منائے گی۔ ویسے بھی تین دن سے زیادہ سوگ بنتا نہیں ہے۔'نوید نے کہا۔

'صحیح کہہ رہا ہے تو۔ سمجھدار ہو گیا ہے۔'خالہ نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

'میں بھی تو باپ تھا۔ مگر مرد کو مضبوط ہونا پڑتا ہے۔'نوید نے کہا۔

'باپ ؟؟؟' کس منہ سے باپ کہہ رہے ہو۔ جس رات ہم ماں بیٹی کو یہاں باہر۔۔۔ جہاں اب سکون سے بیٹھے ہو۔۔۔ اسی جگہ۔۔۔ سردی میں باہر نکال دیا تھا۔ اس دن یہ مضبوط باپ کہاں تھا؟ میری بچی رات بھر ٹھٹھرتی رہی۔ وہ پہلے ہی بخار میں تپ رہی تھی۔ ممتا کی گرمائش کہاں تک دیتی۔ بس پھر ممتا ہار گئی۔ جب میری بچی میرے پیٹ میں تھی تو جو جو زخم تم نے دیئے، تمھیں تو یاد بھی نہیں۔'وہ بولے جا رہی تھی۔

'کیسے بدتمیزی سے بات کر رہی ہیں آپ مہرو باجی۔'رانو نے کہا۔

'یہی کرتی ہے یہ۔ اسی طرح بدتمیزی کرتی ہے۔ اتنی لمبی زبان ہے اس کی۔ اس کو تو آس پڑوس کا بھی خیال نہیں۔ لوگ کیا کہیں گے کہ میری بیوی میرے قابو میں نہیں۔ کچھ کہو تو گھر جانے کی دھمکی دیتی ہے۔ کیا بتاؤں رانو۔ ایک دن بھی سکھ کا نصیب نہیں ہوا اس عورت کے ساتھ۔'نوید نے کہا۔

'تو اندر جا اور سامان باندھ۔۔۔'خالہ نے سختی سے رانو کو کہا۔

'خالہ اس کے معصوم چہرے پہ نہ جانا۔ یہ بہت تیز ہے۔ اور میں کتنا پاگل ہوں۔۔۔ تجھے بتا رہا ہوں۔ تیرے سامنے تیرے بھانجے سے عشق لڑاتی رہی۔ تو روک نہ سکی تو میرے پلے باندھ دیا تاکہ تیری بیٹی کا گھر بچ سکے۔ کیا چال چلی ہے تو نے خالہ۔۔۔ مان گیا تجھے۔ اس نے صرف میری دولت کے لئے مجھ سے شادی کی۔ تو نے بھی اس کو میرے پلے باندھ دیا۔ رانو سے کر دیتی میرا بیاہ، کیا تھا۔ وہ اتنی حسین خوبصورت، نازک کلی۔ کہاں رانو، کہاں یہ۔۔۔۔ عیش کراتا اس کو میں۔'نوید نے کہا۔

'خالہ۔۔۔ میرا امشراز سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔اس کی بری نظر ہے رانو پر۔کتنی بار پیار سے سمجھایا رانو کو کہ اس سے دور رہو۔مگر وہ۔۔۔۔ ہمیشہ مجھے ہی۔۔۔۔'مہرو بول رہی تھی،نوید نے اس کی بات کاٹی۔

'دیکھا۔۔۔ یہ دیکھ خالہ اور بدلے میں اس نے رانو کے منگیتر پر ڈورے ڈالے۔۔۔'نوید نے بات مکمل کی۔

'خالہ۔۔۔ میرا یقین کریں۔۔۔۔ خدا گواہ ہے۔۔۔'مہرو رو رہی تھی اور کچھ بولنا چاہ رہی تھی۔

'بس بیٹی۔۔۔ میں جانتی ہوں تجھے۔۔۔ میں نے کچھ نہیں پوچھا۔پر ایک گلہ ہے تجھ سے۔۔۔ میں نے تجھے مان دیا۔ تجھے بیٹی سے بڑھ کر سمجھا۔۔۔تو نے اس قابل بھی نہ سمجھا کہ اس شخص کی اصلیت بتائے مجھے۔مجھے لگا غصے کا تیز ہے۔۔۔ گھریلو معمولی جھگڑے ہیں۔ پر کیا معلوم تھا کہ یہ شخص تو رہنے کے ہی قابل نہیں۔ابھی چل میرے ساتھ۔اس کی دی ہوئی ایک سوئی بھی ساتھ رکھنے کی ضرورت نہیں'خالہ نے کہا۔

'یہ تو اچھا نہیں کر رہی خالہ۔۔۔ رکھنا تو میں بھی چاہتا لیکن آج تو اسے لے کے نہیں جاسکتی۔'نوید چلایا۔

'زیادہ چالاک نہ بن۔شور مچا کر محلہ اکٹھا کرلوں گی۔بیٹی کے قتل کا مقدمہ درج کروادوں گی۔سمجھتا کیا ہے تو خود کو؟'۔خالہ نے دھمکی دی۔

'اماں۔۔۔نوید بھائی کی بات تو سُن۔۔۔'رانو نے اس کی طرفداری کرنا چاہی۔

'سامان اپنا باندھ لیا ہے تو چل ادھر سے۔'خالہ نے رانو کو ڈانٹا۔

خالہ رانو اور مہرو دونوں کو ساتھ لے کر چلی گئیں۔نوید کی انا یہ بات گنوارا نہ کر رہی تھی کہ وہ خود اس کو چھوڑ کر جائے مگر خالہ کی دھمکی کے بعد اس نے روکنے کی جرات نہ کی۔

....

گوکھوال (فیصل آباد)

عشق کی رمزیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ یار کا دیدار کرتے کرتے، اس کی سوچوں میں گُم بندہ پہلے یار بن جاتا ہے۔ پھر اگلا مرحلہ 'ہُو' کا ہوتا ہے۔اور وہ ہو کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وعدہ نبھاتا رہا۔ بھٹکتا رہا اور بھٹکتا بھٹکتا یہاں آ گیا۔ میرے مُرشد کی قبر ہے یہاں۔ وہ در چھوڑا تو یہی کا ہو کر رہ گیا۔ایک بار وہاں گیا تھا،سوچا زلیخا کی خبر لے آؤں۔ معلوم ہوا کہ وہ تو رخصت ہوگئی۔اس کو پاس والے قبرستان میں دفنایا۔وہاں فاتحہ پڑھی اور یہاں آ گیا۔زندگی میں بہت سی گتھیاں سلجھانی پڑتی ہیں۔کبھی گرہیں لگانی پڑتی ہیں تو کبھی کھولنی پڑتی ہیں۔کبھی ایسا بھی ہوتا کہ گرہیں لگا کر بھولنا پڑتا ہے۔کیا کریں رب سوہنے کا اصول ہی نرالا ہے۔کہاں کہاں کی خاک چھان کے آتا وہیں ہے جہاں لکھا ہوتا ہے۔سب کہتے ہیں بابا جھلا ہے۔۔۔تونے سن رکھا ہوگا۔۔۔دیوانہ ہے ،سایہ ہے بابا پہ۔تعویز کرتا ہے بابا۔۔۔وہ ہنسنے لگا۔اس کو حاضری ہوتا ہے۔۔۔ایسا کچھ نہیں ہے۔بابے نے بس عشق رچایا۔محبوب کی یاد دھمال ڈلوا دیتی ہے۔دنیا سے بےخبر کر دیتی ہے۔کوئی نہیں سمجھ سکتا۔۔۔جب تک اس کھوہ سے پانی نہ پئیں۔۔۔۔یہ تھی بابا چراغ دین کی کہانی۔۔۔۔وہ ہنسنے لگا۔

'بابا گستاخی ہوگی اگر کچھ پوچھوں گا تو۔۔۔مگر سوال پھر وہیں آتا ہے۔۔۔کہ تو چراغ لے کر۔۔۔ چاند کی پہلی رات کہاں جاتا ہے؟؟' مشراز نے پوچھا۔

'کچھ راز راز ہی رہنے دے۔ ہوسکتا ہے کبھی میری کہانی خود سے یاد کرے تو تجھے جواب خود ہی مل جائے۔اب گھر جا۔۔۔انتظار کر رہی ہوگی وہ۔۔۔خود بھی خوش رہ اور اسے بھی خوش رکھنا۔۔۔ جتنا ساتھ ملے۔۔۔ جی لے۔۔۔شکر کر۔۔۔اور راضی رہ۔' بابا نے اسے رخصت کیا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر کی جانب رواں تھا۔اس بار دیوار پھلانگنے کی ضرورت نہیں پیش آئی کیونکہ مہرو پہلے سے ہی دروازے پر کھڑی تھی۔

’تو کیا کہا۔۔۔ بابا نے آج۔۔۔‘ اس نے مشراز کو دروازے پر دیکھتے ہی پوچھا۔

’بتاتا ہوں۔۔۔ پہلے پانی تو پلادو‘ مشراز نے کہا۔

’وہ جھٹ سے کچن سے پانی لے آئی۔اور کہا لیجئے جناب۔‘

’اماں تو نہیں جاگی؟‘ مشراز نے پوچھا۔

’نہیں۔‘ مہرو نے جواب دیا۔

لگتا ہے کہانی مکمل ہوگئی ہے،تمہاری آنکھوں کی چمک بتا رہی ہے۔

بابا چراغ دین نے کہا کہ خوش رہنا، رب جتنا بھی ساتھ دے اس پہ شکر کرنا۔ راضی رہنا۔۔۔ جتنا بھی ساتھ ملے۔سچ بتاؤں مہرو کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم میرے ساتھ ہو۔‘ اس نے مہرو کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

بعض اوقات ہمیں کہاں کہاں سے گزر کر اپنی منزل تک پہنچنا ہوتا ہے۔راستہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔پاؤں چھلنی ہو جاتے ہیں۔زخم ملتے ہیں۔کیا کچھ نہیں ہوتا۔۔۔۔ مگر سہنا پڑتا ہے۔تم جب واپس آئی۔۔۔ پنچایئت بیٹھی۔مجھے ڈر تھا کہ بنا کچھ کئے تمہاری بدنامی ہوگی۔قصور تو میرا تھا کہ میں نے محبت کی تھی،مرد کو کوئی نہیں پوچھتا۔یہی ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔پر عورت کو جواب دہ ہونا پڑتا ہے۔میں نے تمہیں اپنانے کی بات کی تو تب بھی تم پر ہی انگلی اٹھی جبکہ میں تو ایک جائز رشتہ قائم کرنا چاہ رہا تھا۔پر پھر بھی دنیا نے اعتراض کیا۔میں اگلے دس سال بھی مہرو مہرو کرتا تو کوئی نہ پوچھتا۔یہی کہتے کہ تم نے جادو کیا ہے،تم نے جادو کروایا ہے۔اب نازلی کو دیکھو۔۔۔اس کو سمجھایا میں نے کہ آگے بڑھو۔۔۔ پر رُکی رہی۔مگر میں اس کے دل سے کھیلا نہیں۔دوٹوک الفاظ میں بتایا کہ

میرے دل میں کوئی اور ہے۔ کسی اور کی جگہ نہیں۔ ان اتنا وقت تو نہیں تھا کہ کسی کے دل سے کھیلوں۔۔۔ کھیل میں لگ جاتا تو منزل تک کیسے پہنچتا۔۔۔ عشق کا راستہ بابا چراغ دین نے دکھایا۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ عشق کرتا ہوں یا عشق کے کسی مقام پہ پہنچا ہوں۔۔۔ ہاں مگر فیکا، کمالا،۔۔۔ سارے میرے یار دوست کہتے تھے کہ تیری لو سٹوری سنی ہے۔۔۔ زرا ہٹ کر ہوں گی۔۔۔ میں کہتا تھا لو سٹوری کہاں۔۔۔۔ محبت کی داستان کہو۔ اور محبت کی داستان میں جس سے محبت ہو جائے، جو آنکھوں میں سما جائے، وہی ہٹ کر ہوتا ہے۔

'بہت مشکل تھا میرے لئے، اپنے دامن کو بچانا۔۔۔ رانو بچی تھی۔۔۔ بہک گئی پر شکر ہے خالہ نے ساتھ دیا۔

'خالہ زمانے سے ڈری ہوئی تھیں۔۔۔' وہ مسکرانے لگا۔

'خیر۔۔۔ اختتام اچھا ہوا' مہرو نے کہا۔

'صبح ہو گئی۔۔۔ چائے لاؤں؟' مہرو نے مشراز سے پوچھا۔

'ہاں ضرور۔۔۔ پی لیتے ہیں۔۔۔' مشراز نے کہا۔

....

اسلام آباد

'یہ ہمارا گھر ہے کیا؟'۔۔۔ مہرو نے حیرانی سے پوچھا۔

'جی۔۔۔ بالکل۔۔۔ ہمارا۔۔۔ میرا اور تمہارا ذاتی۔۔۔ میری پروموشن ہو گئی ہے اور اب ہم یہاں رہیں گے۔۔۔' مشراز نے بتایا۔

'اماں ہوتیں تو کتنا خوش ہوتیں۔۔۔' مہرو نے کہا۔

'ہاں۔۔۔ بس جتنا جس کے نصیب میں ہوتا ہے۔۔۔' مشراز نے کہا۔

'اللہ مزید کامیابیاں دے۔ آمین۔۔۔' مہرو نے کہا۔

'اب کھانا کا کچھ کریں گے یا ایسے ہی باتوں سے پیٹ بھرے گا؟' مشراز نے ہنستے ہوئے کہا۔

'میں دیکھتی ہوں، کچن میں کیا ہے۔۔۔' مہرو نے کہا۔

'بلکہ ایسا کرتے ہیں کہ کھانا باہر سے آرڈر کر لیتے ہیں۔ آج باقی کام بھی ہیں۔ اور میری گل بھی تھکی ہوئی لگ رہی ہے۔ ہم باپ بیٹی آرام کریں گے۔' مشراز نے اعلان کرتے ہوئے کہا۔

....

مہرو اپنے نئے گھر کے لان میں بیٹھی تھی۔ ساتھ پورچ میں گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ تھی۔ پورچ کے ساتھ ہی اندر جانے کا راستہ تھا جہاں سے اسکی جنت شروع ہوتی تھی۔ لان بھی اسی کا حصہ تھا۔ وہ سرسبز وشاداب لان میں بیٹھی ہاتھ میں چائے کا کپ تھامے جھولا جھول رہی تھی۔ بہت آہستہ سے۔۔۔ ہاتھ میں چائے کے مگ کی طرف دیکھا تو بھاپ اٹھ رہی تھی اور وہ بھاپ اچانک ماضی کے جھروکے میں لے گئی جہاں پنچایئت لگی تھی۔ کچھ نوید کے رشتہ دار تھے تو کوئی خالہ کے۔ وہ جیسے کسی کٹہرے میں کھڑی تھی۔ اسے کس بات کا یقین دلانا تھا کہ وہ بے گناہ ہے مگر گناہ تھا کیا؟ یا اپنے کردار کی پاکیزگی کی گواہی دینی تھی۔ مجھے اس شخص کے ظلم اب مزید برداشت نہیں کرنے یا پھر یہ ایک قاتل ہے۔ میری بچی کا قاتل۔۔۔ طلاق لے کر ساری عمر یہ داغ سجا کر بیٹھی رہوں گی؟ خاندان کی باتوں سے بچوں یا ایک غلط مثال قائم کروں۔۔۔ مار پیٹ، جھوٹ، دھوکہ اور الزام کے بعد بھی وہیں جمی رہوں کیونکہ معاشرہ یہی چاہتا ہے۔۔۔ نہیں۔!

'خالہ اس کے کردار کو تو تُو بھی جانتی ہے۔ بن ماں باپ کی تھی۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔۔۔' نوید نے کہا۔

'بس نوید۔۔۔بن ماں باپ کے ہوتی تو آج تیرے گھر ہوتی۔۔۔اور تیرے جیسے مرد کا کیا اعتبار۔۔۔کس منہ سے گھر لے کے جانے کی بات کر رہا ہے۔وہ تیرے نکاح میں ہے ابھی اور تو بھری برادری میں اس کے کردار پہ کیچڑ اچھال رہا ہے۔' خالہ نے کہا۔

'رانو بھی گواہ ہے۔۔۔کیسے اس نے اس کا گھر۔۔۔' نوید نے کہا۔

'دیکھ چاچا۔۔۔اپنے نوید کو سمجھا۔۔۔میری بیٹی مزید بیچ میں نہ آئے۔۔۔بیٹیاں سب کی سانجھی ہیں۔۔۔' خالہ نے کہا۔

'ہاں ہاں نوید۔۔۔یہ تو غلط کر رہا ہے۔ہم یہ فیصلہ کرنے آئے ہیں کہ تیری بیوی تیرے ساتھ جائے گی یا نہیں۔۔۔' چاچا نے کہا۔

'صلح کی جب گنجائش ہی کوئی نہیں تو بحث کا فائدہ؟' رشیدہ (نوید کی چاچی) نے کہا۔

'ٹھیک ہے اگلے ہفتے تک بتائیں گے کہ حق مہر اور سامان کہاں پہنچانا ہے۔۔۔' خالہ نے کہا۔

'کون سا حق مہر۔۔۔میں تو اسے لے کے جانے کو تیار ہوں۔' نوید نے کہا۔

'گھر ایسے نہیں بسائے جاتے۔۔۔لیکن ہم سوچ کے بتا دیں گے۔۔۔' خالہ نے کہا اور ان سے اجازت چاہی۔۔۔

'چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔گرم کر لیں۔۔۔' مشراز کی آواز اس کی کانوں میں آئی۔

'نہیں ضرورت نہیں۔۔۔' وہ مسکرائی۔

'ایسے ہی مسکراتی رہا کرو۔۔۔اچھی لگتی ہو۔۔۔' وہ بھی مسکرایا۔

....

وہ بوڑھا اس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔کہنے لگا 'کہتا ہوں ناں اسی طرح مسکراتی رہا کرو۔۔۔اچھی لگتی ہو' تم بھی کہتی ہو گی کہ کتنا عجیب شخص ہے،

برسوں سے یہی بات کر رہا ہے۔ پر کیا کروں۔ زندگی کا مقصد ہی تمہاری خوشی، تمہاری مسکان تھا۔تم بھی اتنی جلدی چھوڑ کر چلی گئی۔ پھر کیا مقصد رہ گیا۔تمہیں دیکھنا،تم سے باتیں کرنا۔تمہاری یاد میں جینا۔اس نے اس کی تصویر کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

برسوں سے اس کی یہی روٹین تھی۔اس کی تصویر سے باتیں کرنا۔ریٹائرمنٹ کے بعدتو صبح شام بس یہی کرتا۔واک پہ بھی جاتا تو اس کی ایک تصویر والٹ میں ساتھ ہوتی تھی۔ بچے آتے تو اپنی محبت کی داستان سناتے نہ تھکتا اور کہتا کہ یہ محبت کی رمز سب کو معلوم ہونی چاہیے،۔تاکہ جان سکیں کہ محبت کیا ہے؟ یہ محبت کبھی معدوم نہیں ہونی چاہئے۔ یہ جو برائے نام مجنوں بنے پھرتے ہیں۔انکو کیا معلوم کہ محبت کیا ہے؟ محبت میں جینا مرنا آخر ہے کیا۔جان دینا، جان لینا تو محبت کا قائدہ ہی نہیں۔یہ جو نام نہاد عاشق ہیں ناں محبت کو سکھانے چل پڑتے ہیں۔اب بتاؤ بھلا،محبت تو بڑوں بڑوں کو سکھا دیتی ہے یا سیکھا ہوا بھی بھلا دیتی ہے۔وہ ہنسنے لگا۔

اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔ بہت کمزور ہو گیا تھا۔مگر یادداشت مضبوط تھی خاص طور پہ مہرو کے معاملے میں۔وہ اسکی یادوں کو سینے سے سجائے رکھتا تھا۔اس کی یادیں کبھی پیچھا نہ چھوڑتی۔کسی آسیب، کسی سراب کی طرح۔۔۔مگر وہ خوش تھا۔اس کو سہارا تھا ایک آس تھی۔ایک ساتھ تھا۔

....

'یہ خط لکھا تھا۔۔۔لائی تھی تمہارے لئے۔پھر سوچا کون سا پڑھ لو گے؟ سو معاملہ تقدیر پہ چھوڑتے ہیں۔ہوگئی ملاقات تو وہیں پکڑلوں گی۔کہوں گی کہ یہی رکو۔میری بات سنو' نازلی کہنے لگی۔

وہ دونوں ایک بینچ پر حوض کے سامنے بیٹھے تھے۔اس میں فوارہ لگا تھا۔فوارے کا پانی ہلکہ ہلکہ پھوار بن کر حوض کے کناروں سے ٹکرا کر واپس آ رہا تھا۔وہ مسکرا رہا تھا۔

'ایسا لگ رہا ہے کہ ابھی بھی یونیورسٹی کے لان میں تمہارے ساتھ بیٹھی ہوں۔ اور میری التجائیہ نظریں تم سے مخاطب ہیں اور تم ٹس سے مس نہیں ہورہے ایسے جیسے تمہیں کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔۔۔فرق تمہیں واقعی نہیں پڑا کبھی۔

'تمہارا قصور یہی تھا کہ تم نے تسلیم نہیں کیا'۔مشراز نے کہا۔

'تسلیم تو کر لیا تھا۔ میں تو اس پہ بھی راضی تھی کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے۔ بے شک وہ کنارا بن کے جن کا ملن کبھی نہیں ہوتا'

نازلی نے کہا۔

'ایسا نہیں ہوتا۔۔۔۔ دوست تم کبھی بنی ہی نہیں۔تم نے مجھے محبوب بنائے رکھا۔ایسے میں کیسے ساتھ ممکن تھا۔تمہاری آنکھوں میں پل پل کا گلہ تھا، امید تھی، انتظار تھا، شکایت تھی، چاہ تھی ۔ میں کیا کرتا۔ میں اپنی زندگی اس کے نام کر چکا تھا۔۔۔محبت کی تھی۔۔۔اور یہ داستان جب شروع ہوئی تھی ۔اندازہ ہی نہیں تھا کہ کہاں تک جائے گی ۔ جب اس کا آخری وقت تھا تو کہنے لگی، مشراز۔۔۔۔میرے بچے۔میں نے کہا، میں پالوں گا۔۔۔۔ ماں باپ دونوں کا پیار دوں گا۔۔۔کوئی کمی نہیں ہوگی۔ پگلی بستر مرگ پر تھی، کہنے لگی۔ابھی جوان ہو، حسین تو ہمیشہ رہو گے۔سہرا سجا لو پھر سے۔۔۔کوئی اچھی سی لڑکی ہو۔ خوب گھومنا اس کے ساتھ، اس کا خیال رکھنا۔۔۔۔ اس سے محبت کرنا۔۔۔۔۔۔ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا تو میں نے کہا۔۔۔۔داستاں ختم ہونے والی ہے۔۔۔تم میری آخری محبت ہوا!

مشراز کی آواز بند ہوگئی۔ وہ شاید ہی کچھ بول پاتا۔۔۔۔ نازلی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے دلاسہ دیا۔

'میں کل جارہی ہوں۔' نازلی نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

خیر سے جاؤ۔۔۔مشراز نے کہا۔

بس اتنا ہی؟ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔۔۔پھر وہی امید، شکوہ۔۔۔۔۔۔اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی نازلی نے ٹوک دیا اور کہا۔

وہ کیا ہے ناں ہم ناکام محبت کے ماروں کی زندگی میں یہی کچھ ہے۔ اسی کے ساتھ جیتے ہیں۔وہ چلی گئی۔

مشراز سامنے فوارے سے نکلتے ہوئے پانی کو دیکھ رہا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہونے کو تھے۔ پارک کے باہر ایک گاڑی ہارن دے رہی تھی۔وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

دادا جی۔۔۔آ جائیں۔۔۔دادو انتظار کر رہی ہیں۔۔۔۔بچے نے کہا اور ہنسنے لگا۔

She is with him aahil مناہل نے کہا اور دادا جی کے لئے اتر کے دروازہ کھولا۔

دادا جی۔۔۔مناہل کہہ رہی ہے کہ دادو ساتھ ہیں آپ کے۔۔۔بچے نے کہا۔

مشراز نے جیب سے والٹ نکالا اور کھول کر سامنے رکھ دیا۔ کہنے لگا۔۔۔بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے میری بچی۔۔۔

....

'میری داستان محبت کا اختتام ہو گیا۔۔۔۔ یہ دیکھو۔۔۔۔اس میں سب کچھ ہے۔۔۔۔ایک ایک لمحہ جو ہم نے ساتھ گزارا۔۔۔۔میں کہاں کہاں سے ہو کر تم تک پہنچا اور کیسے تم میرے نصیب میں لکھی جا چکی تھی۔اس نے مسودہ، اس کی تصویر کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

مسودے کا عنوان تھا۔۔۔تم میری آخری محبت ہو۔۔۔۔

یہ جب آئے گا ناں تو تمہارے نام ہو گا۔۔۔۔

ایک خط لکھا ہے نازلی کے لئے، وہ اس تک پہنچا دوں گا۔۔۔۔بتا بھی دوں گا کہ

اس کتاب میں تمہارا بھی ذکر ہے۔محبت پہ مہر لگادی تھی میں نے۔۔۔۔میں نے محبت پا کر مہر لگائی۔۔۔۔۔۔اس نے بنا پائے ہی مہر ثبت کر دی۔اس کی تکلیف میری تکلیف سے کئی گنا زیادہ ہے۔اس کا ہجر میرے ہجر سے کہیں آگے کا ہے۔میں آؤں تو میرا استقبال اچھے سے کرنا۔برسوں کی جدائی کاٹ کر آ رہا ہوں۔یہی مانگا تھا کہ بس ساتھ چاہیے تمہارا۔۔۔۔ ہمیشہ کا۔۔۔۔جو کبھی ختم نہ ہو۔۔۔۔

....

'سنو نازلی، میری طرف سے یہ خط موصول ہو رہا ہے۔۔۔ہاں میری طرف سے۔۔۔میں ہی لکھ رہا ہوں۔کم مسکراؤ۔۔۔اتنا تو حق بنتا ہے میرا۔مہرو نے تو بہت پہلے کہا تھا کہ خط لکھو۔بتاؤ اسے کہ کیسے ہو۔پوچھ بھی لو کہ تم کیسی ہو۔مگر کیا کرتا پھر اس سے وعدہ کیا تھا کہ جب لگا مجھے خط لکھنا چاہئے لکھوں گا ضرور۔اور آج لکھ ڈالا۔۔۔معلوم نہیں کہ کب پہنچے مگر جب پہنچے قبول ضرور کرنا۔۔۔سندیسہ سمجھنا، اجازت نامہ، معافی نامہ یا دعوت نامہ۔۔۔تمہارے Reaction پر منحصر ہے۔میں تو مہرو کو بھی یہی کہا کہ میرا غم تمہارے غم کے سامنے کچھ نہیں مگر فیصلہ تمہارا تھا، اختیار تمہارا تھا۔میرے دل و دماغ رگ رگ پر مہرو چھائی ہوئی تھی میں کیا کرتا۔میں نے محبت کو پا لیا۔۔۔مگر میری محبت کا جہاں سے حصول ہوا تھا ناں وہیں سے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔جیسے۔۔۔۔چلو ایک مثال دیتا ہوں تمہیں۔میں ایک لان بنانا چاہتا ہوں۔کوشش کر کے محنت کر کے بنا لیا۔مگر بنا تو لیا پر اس کو Maintain کرنا مشکل ہے۔اسی طرح میں نے محبت پالی پر اگلا مرحلہ شروع ہو گیا۔اس کو maintain کرنے کا۔اس کو قائم رکھنے اور نشونما کا۔وہ اور بھی کٹھن ہوتا ہے۔۔۔میں یہ سب تمہیں کیوں بتا رہا ہوں۔کہ میری محبت کی داستاں رقم ہو چکی ہے۔ بیٹے کو کہا ہے کہ تمہیں ضرور بھیجے۔

کچھ الفاظ ہی نہیں مل رہے کہ کیا کروں اور کیا کہوں۔بس اتنا ہی کہوں گا کہ تم اپنی

محبت کی داستاں ضرور رقم کرو۔لکھو کہ تم نے محبت کو کیسا پایا۔ تلخ تھا یا شیریں۔۔۔حقیقت کے قریب تھا یا صرف ایک تخیلاتی دنیا میں موجود الف لیلیٰ کی کہانی کی طرح۔۔۔اس امید سے لکھ رہا ہوں کہ یہ خط شائد تمہارے سارے گلے دور کر دے۔لکھا تو کچھ بھی نہیں۔چلو حال پوچھ لیتا ہو۔۔۔

'کیسی ہو نازلی؟'۔۔۔اتنے برس بعد۔۔۔کیسی ہو؟؟

فقط مشراز

....

چاروں اطراف گلاب کی خوشبو تھی۔مٹی کے ڈھیر لگے تھے اور قطبے ان ڈھیروں پر دھنسے ہوئے تھے۔قطبوں پر نام درج تھا۔''مشراز احمد۔۔۔اس قبر میں وہ بوڑھا دفن ہے جس نے 'مہرو' سے بے پناہ محبت کی ہے۔'

مہرین مشراز۔۔۔م سے مہرین،م سے مشراز اور م سے محبت۔

'واہ مشراز۔۔۔آئی تو تم سے بہت سی باتیں کرنے تھی مگر خاموش محبت کا پیغام دیئے جا رہی ہوں۔یہ تمہاری داستانِ محبت ملی۔ابھی ہمت نہیں ہوئی کہ پڑھوں۔۔۔ضرور پڑھوں گی۔ایسا ہو نہیں سکتا کہ تم کچھ بھیجو اور میں نہ پڑھوں۔میں تو ہر دم تمہارا چہرہ،تمہاری آنکھیں پڑھتی آئی ہوں۔سب ایک کھلی کتاب کی مانند تھا۔واضح حروف میں سب لکھا ہوا۔ہمیشہ تمہیں ڈھونڈنے،تمہیں دیکھنے آتی تھی۔اس بار صرف اور صرف ملنے آئی تھی اور دیکھو قدرت نے کیسی ملاقات کرائی۔چلتی ہوں اب۔۔۔تمہاری داستان پڑھ کے تمہیں ضرور بتاؤں گی کہ کیسی لگی اور اپنی بھی لکھوں گی کہ میں نے محبت کو کیسا پایا یا یوں کہو محبت نے میرے ساتھ کیسا سلوک کیا۔میری محبت میں تو الف سے انتظار تھا۔ب سے برسوں کا اور ت سے تمہارا۔۔۔

✿✿.........✿✿

مجھے اچھا لگتا ہے اگر لکھاری بلحاظ کردار اپنے لفظوں کے وزن پر پورا اترے۔ اس سے بھی اچھا لگتا ہے جب کوئی لڑکی خواب بنتی ہے، آنکھوں میں پروتی ہے، ان کے ساتھ جیتی ہے۔

لیکن ان کے پورا نہ ہونے سے ڈرتی نہیں۔

اور یہ بات بھی میرے لئے میرے قلم کی نذر ایسی ہے کہ ایسی سب لڑکیاں ان خوابوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے قلم کی آبرو کا سودا نہیں کرتیں۔

میں سائرہ سے شاید دو بار ملا ہوں اور دونوں ہی بار لگا کہ ایسی ہے، ہماری سائرہ اقبال۔

شاید میرے جیسی۔

میں بچپن میں چاکلیٹ کو ایسے دیکھا کرتا تھا کہ شاید میں یہ کبھی خرید نہیں پاؤں گا۔

پھر میں نے ایک طرح ایجاد کی اور خوابوں کو تعبیر تک پہنچانے کا انوکھا ہنر سیکھ لیا۔

میں سوچتا تھا میں نے چاکلیٹ خرید لی۔ کھا لی۔ اور Wrapper نکال کر ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔

بس اتنی سی اوقات ہے خوابوں کی۔

پورے ہو جائیں تو بے توقیر ہو جاتے ہیں۔

یہی میں نے "مستم" کے ون لائنر میں پڑھا۔

پڑھ کر مسکرا دیا۔۔۔۔ جو میں نے سائرہ سے مل کر اس کے بارے میں جانا تھا۔ اس نے مستم لکھ کر مجھے بتایا کہ خلیل تم نے ٹھیک سمجھا تھا۔

خدا "مستم" کو عزت دے۔۔۔

خلیل الرحمان قمر

@fictionhousepublishers www.fictionhouse.com.pk